سلسلہ مطبوعات (50)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا (القرآن)

حقیقی نظریاتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

بریلوی عالم منظور احمد فیضی کے رسالے
نظریاتِ صحابہؓ
کا مُدَلّل مُفَصَّل اور دندان شکن جواب

اہل انصاف کے لیے دعوتِ فکر

تالیف

وکیل احناف بقیۃ السلف حضرت مولانا نور محمد قادری تونسوی مدظلہ
مدیر جامعہ عثمانیہ ترنڈہ محمد پناہ رحیم یار خان

تقریظ مولانا سعید احمد جلالپوری مدظلہ
ضمیمہ شہیدِ ختم نبوت مولانا یوسف لدھیانویؒ

ناشر اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا (القرآن)

حقیقی نظریاتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

بریلوی عالم منظور احمد فیضی کے رسالے

نظریاتِ صحابہؓ

کا مدلل مفصل اور دندان شکن جواب

تالیف

وکیل احناف حضرت مولانا نور محمد قادری مدظلہ
بقیۃ السلف تونسوی
مدیر جامعہ عثمانیہ ترنڈہ محمد پناہ رحیم یار خان

تقریظ مولانا سعید احمد جلالپوری مدظلہ

ضمیمہ شہید ختم نبوت مولانا یوسف لدھیانویؒ

ناشر اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان



کتاب کا نام ـــــــ حقیقی نظریات صحابہؓ

تالیف ـــــ مولانا نور محمد تونسوی قادری مدظلہ

اشاعت دوم ـــــــ جنوری 2010ء

اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان

http://www.alittehaad.org/.0346-7357394

سعید احمد جلالپوری

جامعة العلوم الاسلامية

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

کراچی ۵۔ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ اس دین کی حفاظت کے لئے پودے لگاتے رہیں گے۔“ بلاشبہ دین کی حفاظت و صیانت کا کام کسی ملک، علاقہ، خطہ، قوم، برادری، جماعت اور فرد کا محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اور جس سے چاہیں حفاظت و صیانت اور دفاع عن الدین کا کام لے سکتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے کام نہ لینا چاہیں تو استعداد و صلاحیت، اسباب و وسائل اور راحت و سہولت کے باوجود بھی وہ اس طرف متوجہ نہیں ہوتا، لیکن اگر بارگاہ صمدیت سے قبولیت کا فیصلہ ہو جائے تو نہ صرف خدمت دین و دفاع حق کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے بلکہ استعداد و صلاحیت اور اسباب و وسائل بھی مہیا ہو جاتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ حضرات جن کی استعداد و صلاحیت کو قبول کر لیا جائے۔ بلاشبہ ہمارے مخدوم مولانا نور محمد قادری تونسوی بھی ان موفق من اللہ بزرگوں میں سے ہیں جن کی زبان و قلم اور استعداد و صلاحیت ماشاء اللہ احقاق حق و ابطال باطل کے لئے استعمال ہو رہی ہے۔ اللھم زد فزد۔

پیش نظر کتاب دراصل بریلوی عالم علامہ منظور احمد فیضی کے رسالہ: ”نظریات صحابہ“ کا مدلل و مفصل جواب ہے۔ جس میں فیضی صاحب نے بزعم خود حضرات صحابہ کرامؓ کو مشہور دیوبندی، بریلوی اختلافی مسائل میں بریلوی عقائد کا حامل ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مولانا نور محمد صاحب نے ماشاء اللہ انہیں قرآن و سنت کا آئینہ دکھا کر ان کے شیش محل کو چکنا چور کر دیا اور ثابت کر دیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ پر یہ الزام ان کے جاں نثار قطعاً برداشت نہیں کریں گے۔

کتاب اہل علم کے علاوہ عوام و خواص سب کے لئے یکساں مفید ہے۔ خصوصاً جو حضرات ایسی فضا میں رہتے ہیں ان کے لئے موثر ہتھیار ہے۔ اللہ تعالیٰ مولف، ناشر، مرتب اور معاونین کی نجات آخرت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

والسلام

سعید احمد

۷/۱/۱۴۲۶ھ

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین

والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین

وعلی آلہ واصحابہ اجمعین الی یوم الدین، اما بعد!

بندہ محتاج بارگاہِ ربِّ صمد، ابواحمد نور محمد قادری تونسوی خادم جامعہ عثمانیہ ترنڈہ محمد پناہ، اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں عرض گزار ہے کہ ایک ساتھی میرے پاس علامہ منظور احمد صاحب فیضی کا تحریر کردہ رسالہ ''نظریاتِ صحابہؓ'' لے کر حاضر ہوئے اور فرمایا کہ: دیکھو کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نظریات یہی تھے؟ بندہ نے اس رسالہ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ علامہ صاحب نے بہت سے غلط نظریات اس مقدس جماعت کی طرف منسوب کردیئے، حالانکہ صحابہ کرامؓ تو ان غلط اور شرکیہ عقائد و اعمال کو جانتے بھی نہیں تھے، جو ان کے سر تھوپے گئے۔ اب بندہ نمبروار ان غلط نظریات کی تردید پیش کرتا ہے، اور علامہ صاحب کے بیان کردہ دلائل کا جواب بھی عرض کیا جائے گا۔

نمبر ا:... اس نمبر میں علامہ صاحب نے عوام الناس کو یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ صحابہ کرامؓ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب و احترام کرتے ہوئے احکامِ خداوندی کو چھوڑ دیتے تھے اور ادب میں آکر اللہ تعالیٰ کے فرائض اور عبادات کو ترک

کر دیتے تھے۔ علامہ صاحب نے اپنے اس غلط مدعا کو ثابت کرنے کے لئے تین واقعات پیش کئے ہیں:

ایک واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کہ انہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر عمرہ کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ مشرکین، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرہ کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے بھی عمرہ نہ کیا اور کہہ دیا کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر عمرہ نہیں کرتا۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں: دیکھو عمرہ خدا کا حکم ہے، اور حضرت عثمانؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے خدا کے حکم کو چھوڑ دیا۔

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک ان کی گود میں تھا، حضرت علیؓ نے عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی، حضرت علیؓ نے ادباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جگایا اور عصر کی نماز ترک کر دی۔

اور تیسرا واقعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے کہ انہوں نے بقول علامہ صاحب، اپنی جان ہلاکت میں ڈال دی اور اپنا پاؤں سانپ سے ڈسوالیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں مت ڈالو، گویا حضرت ابوبکرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی خاطر خدا کا حکم چھوڑ دیا۔

الجواب باسم ملہم الصواب:

علامہ صاحب کا یہ سمجھنا کہ صحابہ کرامؓ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب کرتے ہوئے اللہ کے فرائض چھوڑ دیتے تھے، نہ صرف یہ کہ غلط ہے، بلکہ صحابہ کرامؓ پر بہتان بھی ہے، اس لئے کہ یہ بات تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرضِ منصبی کے بھی خلاف ہے، کیونکہ اللہ کے نبی اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دینے کے لئے دنیا میں تشریف لاتے ہیں، وہ خود بھی اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اللہ کی

عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں جابجا ارشادِ ربانی ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم سے کہا:

"یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ."

ترجمہ:... "اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ."

(النحل:۳۶)

ترجمہ:... "ہر اُمت میں رسول بھیجا گیا ہے اور ہر رسول نے یہی کہا کہ: لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔"

لہٰذا یہ فلسفہ ہی غلط ہے کہ صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب میں اللہ کی عبادت چھوڑ دیتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام فرائض کو زندہ کرانا تھا، نہ کہ فرائض کو ترک کرانا، اگر بالفرض کوئی صحابیٔ رسول ایسا کرتا بھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قطعاً برداشت نہ کرتے اور ضرور منع فرماتے۔

جیسا کہ بعض صحابہؓ نے ادب کے جذبہ کے تحت عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ کو سجدہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اجازت نہیں دی، بلکہ سختی سے منع فرمادیا اور فرمایا کہ: سجدہ اللہ کا حق ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے لئے صحابہ کرامؓ کا اُٹھنا بھی پسند نہیں فرمایا، بلکہ روک دیا، جو پیغمبر اپنے لئے دُوسروں کا اُٹھنا پسند نہیں فرماتا، وہ یہ کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ اس کے لئے اللہ کی عبادت چھوڑ دی جائے یا خدا کا حکم ترک کردیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ادب و احترام فرماتے تھے، وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل تھی، صحابہ کرامؓ کے ہاں تو ادب

کی کوئی ایسی قسم ہی نہیں تھی کہ جس سے فرائضِ خداوندی ترک ہو جائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ادب میں اللہ کے حکم کی تعمیل ہے، بلکہ جس عمل سے احکامِ خداوندی ٹوٹیں اور فرائضِ خداوندی چھوٹیں، وہ عمل ادب نہیں، بلکہ وہ تو پرلے درجہ کی بے ادبی ہے۔ مختصر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ، علامہ فیضی صاحب کے بہتان سے مبرا اور پاک ہیں، انہوں نے ایسی غلطی زندگی بھر نہیں کی، بلکہ یہ سارا کچھ علامہ صاحب کے سوءِ فہم کا نتیجہ ہے، اولئک مبرءون مما یقولون! اولئک هم المتقون!

علامہ صاحب نے جن دلائل سے اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اب اس کی حقیقت بھی سن لیجئے!

حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے
علامہ فیضی کا مدعا ثابت نہیں ہوتا:

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایلچی بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا گیا، مشرکینِ مکہ کی طرف سے حضرت عثمانؓ کو پیشکش کی گئی کہ آپ عمرہ ادا کرلیں، طواف کرلیں، آپ کو اجازت ہے، حضرت عثمانؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر عمرہ اور طواف کرنا گوارا نہ کیا اور واپس آ گئے، خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حضرت عثمانؓ سے یہی توقع تھی کہ وہ میرے بغیر طواف نہیں کریں گے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے واقعی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر عمرہ کرنے سے انکار کردیا، لیکن عمرہ فرض نہیں ہے، بلکہ مستحب اور نفلی عبادت ہے، قرآن مجید میں: "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" (البقرہ:۱۹۶) کا حکم ہے، لیکن حج کے لئے یہ وجوبی حکم ہے، اور عمرہ کا حکم استحبابی ہے، اللہ تعالیٰ کا ہر حکم فرض نہیں ہوتا۔ دیکھو! قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: "وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا" یعنی جب حج کا احرام کھولو تو

شکار کرو، اللہ کا حکم ہے، لیکن یہ حکم اِباحت اور اجازت کے لئے ہے۔ اگر کسی شخص نے حج کیا اور احرام سے فارغ ہو گیا اور شکار نہیں کیا، تو اس کے بارہ میں یہ نہیں کہیں گے کہ اس شخص نے حکمِ خداوندی کے خلاف کیا اور فرض کو چھوڑ دیا، کیونکہ یہ حکم صرف اجازت کی حد تک ہے۔

میرے خیال میں علامہ صاحب نے بھی حج کیا ہوگا، احرام باندھا ہوگا اور کھولا بھی ہوگا، اور احرام کھولنے کے بعد شکار نہیں کیا ہوگا، بلکہ یقیناً نہیں کیا ہوگا، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ علامہ صاحب نے حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کی یا فرض ترک کر دیا؟ نہیں! نہیں! کیونکہ شکار کا حکم، حکمِ اباحت ہے، اس پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔

پس "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ" (البقرہ:۱۹۶) اس آیت میں عمرہ کا حکم استحبابی ہے، اور عمرہ نفلی عبادت ہے، جس کو چھوڑ دینے کی شرعاً اجازت ہے، علامہ صاحب جانتے ہیں کہ فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اپنے دوست کی خاطر اس کا دل خوش کرنے کے لئے نفلی روزہ توڑ دینا جائز ہے۔ علامہ صاحب تو فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے اللہ کی عبادت چھوڑ دی، اور پھر اس پر نامعلوم کیا کیا عمارتیں کھڑی کیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، لیکن شریعت تو ایک دوست کے لئے نفلی عبادت توڑنے کی اجازت دے رہی ہے۔ کیا علامہ صاحب اس سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کریں گے؟ بہر حال حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے کسی فرض کو نہیں چھوڑا، بلکہ اس موقع پر انہوں نے جو کچھ کیا حکمِ خداوندی کے مطابق کیا، ان کے لئے اس موقع پر حکمِ خداوندی یہی تھا جو کہ انہوں نے کیا، لہٰذا علامہ فیضی صاحب کا اس واقعہ سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، اور نہ ہی ان کا غلط نظریہ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے، بلکہ علامہ صاحب کی پیش کردہ دلیل سے خود ان کا اپنا عقیدۂ حاضر و

ناظر بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔

علامہ فیضی کی پیش کردہ دلیل سے عقیدۂ حاضر و ناظر کی تردید:

علامہ صاحب ''نظریاتِ صحابہ'' صفحہ:۱۶ پر لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عثمانؓ نے فرمایا: میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بغیر عمرہ نہیں کروں گا!''

معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ اکیلے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت حدیبیہ کے مقام پر تشریف فرما تھے، اسی لئے تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں آپؐ کے بغیر عمرہ نہیں کروں گا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر جگہ حاضر و ناظر اور موجود ہونے کے قائل نہ تھے! اب علامہ صاحب کو چاہئے کہ وہ حضرت عثمانِ غنیؓ کی طرح عقیدہ رکھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں، اور یہ دلیل بھی ان کی اپنی پیش کی ہوئی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ علامہ صاحب، حضرت عثمانؓ کے اس نظریہ کو قبول کرتے ہیں یا ردّ کرتے ہیں؟

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلفِ دراز میں
لو آج اپنے دام میں صیاد آگیا!

افسوس کا مقام:

علامہ فیضی صاحب اپنی کتاب میں ثابت تو یہ کرنا چاہ رہے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب اللہ تعالیٰ کی عبادت سے زیادہ اہم ہے، اور اپنا حال یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ مبارک لکھتے ہیں تو صرف ''حضور'' لکھتے ہیں، حتیٰ کہ درود شریف بھی ساتھ نہیں لکھتے، جیسا کہ پچھلے حوالے میں آپ نے دیکھ لیا،

''حضور'' کے لفظ کے آگے قوسین میں ''صلی اللہ علیہ وسلم'' ہم نے لکھا ہے، علامہ صاحب نے صرف ''حضورؐ'' ہی لکھا ہے، درود شریف اور لقب کچھ نہیں لکھا۔ دوسروں کو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی تعلیم اور اہمیت بتلائی جائے اور خود اس پر عمل نہ کیا جائے، نہایت افسوس کا مقام ہے!

حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ سے بھی علامہ فیضی کا مدعا ثابت نہیں ہوتا:

علامہ صاحب نے اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعۂ غار بیان فرمایا کہ:

> ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكة!'' یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، مگر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس حکم خداوندی سے اہم حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و آرام اور تعظیم کو جانا، لہٰذا جسم کو سانپ کے حوالہ کر دیا، اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔''
>
> (نظریاتِ صحابہؓ ص:۱۵)

ناظرینِ کرام! حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی خاطر جو کچھ کیا، وہ سب کچھ حکمِ خداوندی کے مطابق کیا ہے، اس وقت اُن کے لئے حکمِ خداوندی یہی تھا کہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں، اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے دوران کسی حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کی، اور نہ اللہ تعالیٰ کے کسی فرض کو چھوڑا، یہ سیدنا صدیق اکبرؓ پر بہتان ہے اور وہ اس الزام سے مبرا ہیں۔

علامہ صاحب نے جو آیت پیش کی، وہ آیت مجاہدینِ اسلام اور دینِ حق کے

لئے قربانی دینے والوں کے حق میں نازل نہیں ہوئی کہ تم جہاد میں جاکر اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، بلکہ اس آیت کی صحیح اور راجح تفسیر جو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں ترکِ جہاد کر کے اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ پوری آیت ذرا ملاحظہ فرمائیں:

"وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِأَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ." (البقرہ:۱۹۵)

یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ کرو، اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، چونکہ اس آیت سے پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم ہے، اسی لئے بعض مفسرین نے فرمایا کہ: آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرو اور بخل کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

علامہ صاحب اگر اس آیت کی تفسیر سمجھنے کے لئے صرف "تفسیرِ جلالین" دیکھ لیتے تو اُن کو آیت کا صحیح مطلب معلوم ہوجاتا، چنانچہ صاحبِ جلالین اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"الھلاک بالامساک فی الجھاد او ترکہ."

یعنی جہاد چھوڑ کر یا جہاد میں بخل کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

افسوس یہ ہے کہ علامہ صاحب نے اس کا مطلب معلوم کرنے کے لئے مولوی احمد رضا خان کی "کنزالایمان" کا حاشیہ بھی نہ دیکھا، ورنہ حقیقت ان کو معلوم ہوجاتی، چنانچہ مفتی نعیم الدین صاحب مرادآبادی اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں:

"راہِ خدا میں انفاق کا ترک بھی سببِ ہلاک ہے، اور اسراف بے جا بھی .....الخ۔" (حاشیہ کنزالایمان ص:۴۵)

قرآن مجید میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسی آیات ہیں جن میں مال و جان سے جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی۔ مال و جان سے جہاد کرنے والوں کی تعریف کی گئی

ہے، شہداً کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، ان کے درجات بتائے گئے ہیں، اور حکم دیا گیا ہے کہ اپنی جانوں کو دینِ حق کی سربلندی کی خاطر قربانی کے لئے پیش کرو۔ ایک طرف تو راہِ خدا میں اپنی جانوں کو پیش کرنے کی اتنی ترغیب دی جائے، اور دوسری طرف کہا جائے کہ راہِ خدا میں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، یہ ناممکن بلکہ محال ہے۔ سوائے جنگِ حنین کے ہر جنگ میں کفار و مشرکین مادّی قوت میں مسلمانوں سے زیادہ رہے، مسلمان تعداد میں، اسلحہ میں، خورد و نوش میں کم رہے، لیکن اس کے باوجود مسلمان ہر میدان میں لڑے اور بے سروسامانی کے عالم میں لڑے، اس کے نتیجہ میں کچھ زخمی ہوئے، کچھ شہید ہوئے، کیا انہوں نے یہ سب کچھ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کی...؟ توبہ! توبہ!

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر کے جہاد کیا، حق کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کیا، یہ سب کچھ حکمِ خداوندی کے مطابق کیا، یہ ان کا فرض تھا جو انہوں نے پورا کیا، واللہ! انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہ توڑا ہے، نہ چھوڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا تمام مؤمنین کو حکم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کریں، ادب کریں، آپ کی تائید اور نصرت کریں، اور آپؐ کی جان کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھیں، بوقتِ ضرورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید، نصرت اور حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان، مال، اولاد، وطن وغیرہ سب کچھ قربان کر دیں، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا سارا سفرِ ہجرت دینِ حق کی سربلندی کے لئے تھا، اور یہ بہت بڑا جہاد اور اللہ کے حکم کی تعمیل ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو "ثانی اثنین" کا لقب ملا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ علامہ فیضی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر کے حکمِ خداوندی: "وَلَا تُلْقُوْا

بِأَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ'' (البقرہ:۱۹۵) کی خلاف ورزی کی ہے۔

تعجب کا مقام:

علامہ صاحب کے رسالہ کے پہلے صفحہ پر علامہ صاحب کو ''شیخ القرآن'' کا لقب دیا گیا ہے، حالانکہ علامہ صاحب تو آیاتِ قرآنی کا مفہوم بھی نہیں سمجھ سکے، جیسا کہ آیتِ مذکورہ بالا کا غلط اور اُلٹا مفہوم سمجھا، خدا جانے ان کو ''شیخ القرآن'' کا لقب کیسے دے دیا گیا؟

علامہ فیضی کے قلم سے حضرت ابوبکرؓ کی توہین:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حکمِ خداوندی کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اور اپنی جان کی قربانی پیش کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کا تحفظ کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکون و آرام پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، لیکن سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس عظیم قربانی کے متعلق علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ''اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا'' استغفراللہ! معاذ اللہ! یارِ غار اور ثانی اثنین کے القاب پانے والے صحابیٔ رسول کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرنا ان کی توہین اور گستاخی ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو گستاخی سے بچائے، آمین!

لہٰذا علامہ صاحب کا واقعۂ غار سے استدلال کرنا باطل ٹھیرا، البتہ اس واقعہ سے خود علامہ صاحب کے عقیدۂ علمِ غیب کی تردید ہو جاتی ہے۔

واقعۂ غار سے حضور اکرمؐ کے عالم الغیب ہونے کی تردید:

علامہ صاحب نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جو غارِ ثور کا واقعہ بیان کیا ہے، اس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہوتے اور آپ کو معلوم ہوتا کہ غار کے اندر سانپ چھپا ہوا ہے، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ غار کے سوراخ میں ایڑی

دے گا، تو سانپ اس کو ڈس لے گا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش نہ رہتے، بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سب کچھ بتادیتے اور غار کے اندر جانے سے بھی روکتے اور سوراخ میں ایڑی دینے سے بھی روکتے، یہ ناممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان خطرات کو جانتے بھی ہوں اور بتائیں بھی نہیں، تو معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں ہیں۔

حضرت علیؓ کے قصہ سے

علامہ فیضی کا استدلال اور اس کا ابطال:

علامہ صاحب اپنا مدعا و مطلب ثابت کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قصہ بیان کرتے ہیں:

> ”حضرات! مقامِ غور ہے! اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ”حافظوا علی الصلوات والصلوٰة الوسطٰی“ تمام نمازوں کی حفاظت کرو، قضا نہ ہونے دینا، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرض نماز عصر سے حضور کی عزت وعظمت اور آرام کو اہم فرض سمجھا، اسی لئے عصر کی نماز کو حضور کے آرام پر قربان کردیا۔“ (نظریاتِ صحابہ ص:۱۵)

قارئینِ کرام! اس قصہ سے بھی علامہ صاحب کا غلط نظریہ ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ محدثین کی ایک جماعت نے فرمایا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قصہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، بلکہ موضوع ہے، تفصیل کے لئے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ”منہاج السنۃ“ جلد:۴ از صفحہ:۱۸۶ تا ۱۹۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

مُلّا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محدثین نے اس قصہ کو موضوع قرار دیا ہے۔ (موضوعاتِ کبیر ص:۱۵۲، ۱۵۷)

جب یہ قصہ سرے سے صحیح ہی نہیں، تو اس سے استدلال کرنا خود بخود باطل ہوگیا۔

اگر اس واقعہ کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس کی بعض روایات میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ’’حضرت علیؓ نے اشارہ سے نماز پڑھ لی تھی‘‘، لہٰذا اس سے بھی علامہ صاحب کا مدعا ثابت نہ ہوگا۔

بر سبیل تنزل اگر اس واقعہ کو بھی صحیح مان لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت علیؓ سے نمازِ عصر فوت ہوگئی تھی، تو پھر بھی علامہ صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہوگا، کیونکہ اس وقت حضرت علیؓ مجبور تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی گود میں آرام فرما تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہو رہی تھی اور نزولِ وحی میں مداخلت کرنا سخت منع ہے، اس وقت حضرت علیؓ کو مجبوری اور معذوری والے احکامِ شرعیہ پر عمل کرنا تھا، چنانچہ بیمار اور مسافر کو شرعاً اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے، اگر بیمار اور مسافر لوگ اپنی مجبوری اور معذوری کی وجہ سے روزہ نہ رکھیں تو ان کو یہ طعنہ نہ دیا جائے گا کہ انہوں نے حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کی یا اللہ کے حکم کو ترک کردیا، کیونکہ وہ مجبور اور معذور ہیں، اور اس مجبوری اور معذوری میں انہوں نے جو کچھ کیا، اللہ کے حکم کے مطابق کیا، اس خاص حالت میں ان کے لئے حکمِ خداوندی یہی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں۔

اسی طرح نماز میں قیام فرض ہے، لیکن اگر کوئی شخص معذور ہے اور قیام نہیں کرسکتا تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا، اور جو معذور بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے اس پر یہ الزام نہ لگایا جائے گا کہ اس نے قیام والا فرض ترک کردیا اور حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی ہے، کیونکہ وہ معذور ہے اور اس وقت اس کے لئے حکمِ خداوندی یہی ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھے۔

نیز اگر کسی مسلمان کو خدانخواستہ کفار، کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کردیں (ورنہ جان

سے مار دینے کی دھمکی دیں)، تو اب یہ مسلمان مجبور ہے اور شرعاً اس کو اجازت ہے کہ کلمۂ کفر کو زبان سے کہہ کر اپنی جان بچائے، بشرطیکہ اس کا دل مطمئن ہو، اس صورت میں ہم اس کو کافر اور حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے والا نہ کہیں گے، کیونکہ مجبوری کی حالت میں اس کے لئے حکمِ خداوندی یہی ہے۔

بہرحال عام حالات میں اَحکامِ خداوندی اور ہوتے ہیں، اور مجبوری کے وقت اور ہوتے ہیں، جن کو فقہاً ''عزیمت'' اور ''رُخصت'' سے تعبیر کرتے ہیں، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو عصر کی نماز فوت ہوئی وہ اسی مجبوری کی حالت میں ہوئی ہے، چنانچہ حضرت علیؓ نے مجبوری والے حکمِ شرعی پر عمل کیا، یعنی اس وقت حضرت علیؓ کے لئے حکمِ شرعی یہی تھا، انہوں نے جو کچھ کیا حکمِ شرعی کے مطابق کیا، اس کے خلاف نہیں کیا۔

ایک آدمی سو رہا تھا اور نیند کی حالت میں اس کی نماز فوت ہوگئی، اس کے لئے حکمِ شرعی یہ ہے کہ اب فوت شدہ نماز کو قضا کرے، جس کی حالتِ نیند میں نماز ترک ہوئی ہے تو یہ نہ کہا جائے گا کہ اس نے حکمِ خداوندی ترک کردیا، کیونکہ نیند ایک مجبوری ہے۔ اور اس مجبوری میں اس سے جو کچھ ہوا اس پر اس کو تارکِ فرض کا الزام نہیں دیا جائے گا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے سب کچھ حکمِ شرعی کے مطابق کیا۔

قارئین سے انصاف کی درخواست

شریعت میں نیند ایک شرعی عذر ہے، اگر کسی شخص سے نیند کی وجہ سے نماز فوت ہوجائے تو اس پر ترکِ فریضہ کا الزام نہیں لگایا جائے گا، کیونکہ وہ شخص نیند کی وجہ سے معذور ہے، جب عام آدمی اپنی نیند کی وجہ سے معذور سمجھا جاتا ہے اور اس پر معذوروں والے اَحکام نافذ ہوتے ہیں، تو کیا سیدنا حضرت علیؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کی وجہ سے معذور نہ ہوں گے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف نیند میں

نہیں تھے، بلکہ آپ پر نزولِ وحی کا سلسلہ بھی جاری تھا، تو کیا اس دوہری مجبوری کی وجہ سے حضرت علیؓ پر مجبوروں اور معذوروں والے اَحکام نافذ نہ ہوئے؟ لیکن علامہ صاحب ان سب مجبوریوں کے باوجود کہتے ہیں کہ:

''حضرت علیؓ نے ترکِ فریضہ کا ارتکاب کیا''

اہلِ علم خود انصاف فرمائیں کہ ایک آدمی معذور اور مجبور ہے، اور وہ ایسے حالات میں ''رُخصت'' پر عمل کرتا ہے، تو کیا ایسے شخص کو موردِ الزام ٹھہرانا کہ اس نے حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کی ہے، کہاں تک درست ہے؟ بہرحال حضرت علیؓ نے ایسے حالات میں جو کچھ کیا، حکمِ شرعی کے مطابق کیا، نعوذ باللہ! خدا کے کسی حکم کو توڑا نہیں ہے، یہ سب کچھ علامہ صاحب کے سوءِ فہم کا نتیجہ ہے۔

شیعہ والا ذہن:

شیعہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان حد سے بڑھانے کے لئے اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، آپؐ سجدہ میں تھے اور حضرت حسینؓ چھوٹے بچے تھے اور وہاں آگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں دیکھ کر آپؐ پر سوار ہوگئے، آپؐ نے سجدہ لمبا کردیا، جب تک حضرت حسینؓ اُترے نہیں، آپؐ نے سجدہ سے سر اُٹھایا نہیں۔ شیعہ لوگوں نے اس روایت سے فوراً یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ:

''دیکھو! حضرت حسینؓ کی شان نماز سے زیادہ ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وجہ سے نماز موقوف کردی، بلکہ حضرت حسینؓ کا مقام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اُونچا ہوگیا، آپؐ نیچے تھے اور حضرت حسینؓ اُوپر تھے۔''

معاذ اللہ! استغفر اللہ!

یہ ہے شیعہ کا ذہن اور شیعہ کا طرزِ استدلال! اُدھر علامہ صاحب کے طرزِ استدلال کو دیکھو! دونوں ان واقعات سے کیسے کیسے عجیب و غریب نتائج برآمد کر رہے ہیں۔

بچے کے رونے کی وجہ سے
حضور اکرمؐ نے نماز میں تخفیف کردی:

صحاحِ ستہ کی ایک حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

> ''میں یہ خیال کر کے نماز شروع کرتا ہوں کہ قرأت کو لمبا کروں گا اور لمبی نماز پڑھاؤں گا، لیکن دورانِ نماز کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں، تو بچے کے رونے کی وجہ سے میں اپنا ارادہ ترک کردیتا ہوں اور نماز میں تخفیف کردیتا ہوں کہ شاید بچے کی ماں بھی میرے پیچھے نماز باجماعت میں شامل ہو، اور وہ اپنے بچے کی آواز پہچان لے اور اس کا ذہن بچے کی طرف چلا جائے، مبادا اس عورت کی نماز میں خلل واقع ہوجائے، لہٰذا اس بچے اور اس کی ماں کی خاطر میں اپنی نماز کو مختصر کردیتا ہوں۔''

اب یہ دونوں (علامہ صاحب اور شیعہ لوگ) کیا اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ ایک بچہ کی شان نماز سے بھی بڑھ گئی؟ امام (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی بڑھ گئی، اور مقتدیوں (صحابہؓ وصحابیاتؓ) سے بھی بڑھ گئی، نہیں، نہیں! بلکہ قطعاً نہیں! ان واقعات سے اس قسم کے نتائج اخذ کرنا غلط ہے، بلکہ نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں سے پیار تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے

شفقت فرماتے تھے، حتیٰ کہ نماز میں بھی ان کی رعایت فرماتے تھے۔

علامہ صاحب کی دلیل سے عقیدۂ علمِ غیب کی تردید:

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابھی تک عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پوچھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی کہ اے علیؓ! کیا تو نے عصر کی نماز نہیں پڑھی؟ کیونکہ علامہ صاحب کے عقیدہ کے مطابق ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہیں''، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہوتے تو آپؐ فرماتے: اے علیؓ! تو نے عصر کی نماز نہیں پڑھی، لہٰذا اب وقت میں پڑھ لے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو سب کچھ بتادیتے۔

اظہارِ تشکر:

علامہ صاحب نے اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب میں فرائضِ خداوندی ترک کردیتے تھے، الحمدللہ! ہم نے دلائل سے ثابت کردیا ہے کہ اصحابِ رسولؐ کا دامن اس بہتان سے پاک وصاف ہے، وہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب واحترام بھی حکمِ خداوندی کی وجہ سے کرتے تھے، اور ہر موقع ومحل کی عبادت بھی ترک نہیں فرماتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، خود اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب واحترام سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا شوق بڑھتا ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور کرانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

اے اللہ! ہم سب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب واحترام اور اتباع وتابعداری کے طفیل اپنی اطاعت اور بندگی کی توفیق عطا فرما، آمین!

نمبر۲:... اس نمبر میں علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''صحابہؓ حضور علیہ السلام کو''یا'' سے پکارتے تھے۔''

(نظریاتِ صحابہ ص:۱۶)

اس دعویٰ کے ثبوت میں علامہ صاحب نے چند دلائل پیش کئے:

الف:... جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو صحابہ کرامؓ نے خوشی میں جلوس نکالا، استقبال کیا، اور''یا رسول اللہ'' کہا۔

ب:... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو''یا'' سے پکارا۔

ج:... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے''یا رسول اللہ'' کہا۔

ر:... حضرت راجزؓ نے''اغثنی یا رسول اللہ'' کہا۔

س:... مسیلمہ کذاب کی جنگ میں بھی مسلمانوں نے''یا محمد'' کہا۔ (ملخصاً)

الجواب:

یہ ہے علامہ صاحب کا دعویٰ اور ان کے بیان کردہ دلائل کا خلاصہ، لیکن گزارش یہ ہے کہ علامہ صاحب نے تو صرف چند صحابہ کرامؓ سے''یا رسول اللہ'' کہنا ثابت کیا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرامؓ جب بھی آپؐ کو ملتے تھے تو''یا رسول اللہ'' کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے تھے، اور یہ پوری زندگی ان کا معمول رہا۔

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی جب صحابہ کرامؓ روضۂ اقدس پر حاضری دیتے تھے تو''یا رسول اللہ'' کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کرتے تھے۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر آج تک تمام مسلمانانِ عالم ''التحیات'' میں ''السلام علیک ایھا النبی'' کہتے چلے آئے ہیں، اور قیامت تک کہتے رہیں گے، اور اس میں تو کسی مسلمان کو اختلاف ہو بھی نہیں سکتا، اور اسی طرح محبت اور اشتیاق کے جذبہ کے تحت بعض صحابہ کرامؓ اور اولیاؒ اللہ سے ''یا رسول اللہ'' غائبانہ طور پر بھی کہنا ثابت ہے، لیکن اختلاف تو ان نتائج سے ہے جن کو علامہ صاحب نے ''یا رسول اللہ'' کے الفاظ سے اخذ کیا ہے، علامہ صاحب ''یا رسول اللہ'' کے کلمہ سے ایک تو حاضر و ناظر کا عقیدہ کشید کرنا چاہتے ہیں کہ جب صحابہ کرامؓ قریب و دور سے ''یا رسول اللہ'' کہتے تھے، تو گویا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتے تھے، کیونکہ ''یا رسول اللہ'' کا معنی ہے: ''اے اللہ کے رسول'' لہٰذا ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھتے تھے۔

اور دوسرا ''یا رسول اللہ'' سے مختارِ کل کا مسئلہ اخذ کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ علامہ صاحب کے گمان میں صحابہ کرامؓ ''یا رسول اللہ'' کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگتے تھے، جب مدد مانگتے تھے تو ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختارِ کل ہیں۔

لیکن ''یا رسول اللہ'' سے یہ دونوں غلط عقائد کشید کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ کسی صحابی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر جگہ حاضر و ناظر کا عقیدہ رکھ کر ''یا رسول اللہ'' نہیں کہا، اور نہ ہی کسی صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختارِ کل سمجھ کر مدد کے لئے ''یا رسول اللہ'' کہہ کر پکارا ہے، اگر علامہ صاحب میں ہمت ہے تو کسی ایک صحابی کے متعلق صحیح روایت سے ثابت کر دیں کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھ کر یا مختارِ کل سمجھ کر ''یا رسول اللہ'' کہتے تھے، صرف اور صرف ''یا'' کو دیکھ کر علامہ صاحب کو خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہئے، کیونکہ حرفِ ''یا'' تو عربی گرامر کی رو سے قریب و بعید دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ عربی گرامر کی پہلی کتاب نحو میر

میں لکھا ہے:

"بدانکہ اَی و ہمزہ برائے نزدیک است و اَیَـا و ھَیَـا برائے دور و یا عام است۔"

یعنی اَی اور ہمزہ ندائے قریب کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اور ایا و ھیا دور کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اور یا عام ہے، قریب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور بعید کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ حرفِ "یا" ندائے قریب کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور ندائے بعید کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی اس حرفِ "یا" کو قریب و دور دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے، لہٰذا علامہ صاحب کا "یا رسول اللہ" کے کلمہ سے حاضر و ناظر کا نتیجہ اخذ کرنا کم فہمی اور کم علمی کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح "یا رسول اللہ" کے کلمہ سے مختارِ کل کا عقیدہ نکالنا بھی صحیح نہیں، چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حرفِ "یا" کے ساتھ مختلف قسم کے لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے، لیکن ان مخاطبین میں سے کسی کے متعلق نہ تو حاضر و ناظر کا عقیدہ ثابت کیا گیا ہے اور نہ ہی مختارِ کل کا عقیدہ گھڑا گیا ہے، مثلاً:

۱:... "قُلْ یٰـاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ"

۲:... "یٰـاَیُّهَا النَّاسُ"

۳:... "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ."

۴:... "یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا"

۵:... "یٰـاَهْلَ الْکِتٰبِ"

۶:... "وَاِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا"

حرفِ "یا" کے ساتھ یہ سب خطابات قرآن مجید میں موجود ہیں، اور کروڑہا مسلمانانِ عالم روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، اور آیاتِ مذکورہ بالا بھی ان کی

تلاوت میں شامل ہوتی ہیں، لیکن یہ کسی شخص کا عقیدہ نہیں ہے کہ ''یا'' کے ساتھ جن کو قرآن میں مخاطب کیا گیا ہے وہ سب لوگ ہر جگہ حاضر و ناظر بھی ہیں اور مختارِ کل بھی۔

بہرحال یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ''یا'' کے ذریعہ کسی کو مخاطب کرنے سے نہ تو وہ ہر جگہ حاضر و ناظر بن جاتا ہے، اور نہ ہی وہ مختارِ کل بن جاتا ہے۔ جن صحابہ کرامؓ سے علامہ صاحب نے دور سے ''یا رسول اللہ'' کہنا ثابت کیا ہے، وہ حضرات بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے، اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختارِ کل جانتے تھے، محبت و اشتیاق میں اگر کسی نے ''یا رسول اللہ'' کہا اور حاضر و ناظر اور مختارِ کل کا عقیدہ نہیں رکھا تو اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔

علامہ صاحب کے امام، احمد رضا خان صاحب کے نزدیک بھی خطاب کے وقت مخاطب کا حاضر و ناظر ہونا ضروری نہیں:

علامہ صاحب کے امام اعلیٰ حضرت خان صاحب ''حدائق بخشش'' حصہ دوم صفحہ: ۵۰ میں نجدیوں کو مخاطب بنا کر فرماتے ہیں:

''سر سوئے روضہ جھکا پھر تجھ کو کیا
دل تھا ساجد نجد یا پھر تجھ کو کیا
بیٹھتے اُٹھتے مدد کے واسطے
یا رسول اللہ کہا پھر تجھ کو کیا''

اب علامہ صاحب بتائیں کہ اعلیٰ حضرت جو نجدیوں کو خطاب فرما رہے ہیں، کیا نجدی بھی ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں؟ پس معلوم ہوا کہ خطاب کے وقت مخاطب کا حاضر و ناظر ہونا اور موجود ہونا ضروری نہیں، بلکہ خطاب غائب کو بھی ہوسکتا ہے۔ اور صحابہ کرامؓ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غائب سمجھ کر ''یا رسول اللہ'' سے خطاب فرماتے تھے، جیسا کہ علامہ صاحب کے مقتدا و رہنما اور مشہور عالم علامہ

عبدالسمیع صاحب رامپوری لکھتے ہیں:

''کلامِ صحابہؓ میں غائب کو خطاب اور ندا موجود ہے۔''

(انوارِ ساطعہ ص:۲۲۹)

بہرحال دلائل مذکورہ بالا کی روشنی میں ہر منصف مزاج آدمی اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ''یا'' کے حرف سے نہ تو حاضر و ناظر کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے، اور نہ ہی مختارِ کل کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے، خصوصاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے، کیونکہ تیئس برس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن سنا کر اللہ تعالیٰ کی توحید کا سبق دیا اور انہوں نے پوری زندگی دل کی گہرائیوں سے ہر نماز میں ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' پڑھا اور سنا، ان سے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مختارِ کل اور حاضر و ناظر سمجھ کر مدد مانگیں، وہ نفوسِ قدسیہ اس ناپاک تہمت سے مبرا اور تمام شرکیہ عقائد سے منزہ ہیں۔

اس اُصولی گفتگو کے بعد اب فرداً فرداً اُن روایات کی حقیقت بھی معلوم کیجئے جن کو علامہ صاحب نے بطورِ دلیل پیش کیا ہے۔

علامہ صاحب جزء ''الف'' میں فرماتے ہیں کہ:

''جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خوشی میں جلوس نکالا، استقبال کیا اور ''یا رسول اللہ'' کہا۔''

الجواب:

صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان استقبال کیا، آپ کی آمد کے منتظر رہے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو خوشی اور اشتیاق میں ''یا رسول اللہ'' کہا، لیکن نہ تو صحابہ کرامؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر

و ناظر سمجھا اور نہ ہی آپ کو مختارِ کل سمجھ کر آپ سے مدد مانگی، اگر کسی روایت سے یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے، تو علامہ صاحب پیش کریں اور انعام حاصل کریں، باقی صرف حرفِ ''یا'' سے عوام کو مغالطہ میں نہ ڈالیں، کیونکہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ''یا'' حرفِ ندا ہے، جو قریب و بعید دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ورنہ قرآن مجید میں ''یا بنی اسرائیل'' موجود ہے، حالانکہ قومِ بنی اسرائیل نہ ہی ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، اور نہ ہی مختارِ کل ہے۔

خود علامہ صاحب کو اپنے عقیدہ میں شک ہے:

علامہ صاحب لکھتے ہیں:

''اہل مدینہ ہر راستہ میں یا رسول اللہ کہہ رہے تھے، اگر حضور ہر راستے میں تھے تو حاضر و ناظر ثابت، اور اگر حضور بظاہر ایک راستہ میں تھے، تو جس راستہ میں حضور بجسدہ العنصری نہ تھے تو وہاں بھی صحابہؓ یا رسول اللہ کا نعرہ لگا رہے تھے۔''

(نظریاتِ صحابہ ص:۱۷)

لہٰذا اب تک خود علامہ صاحب شک میں پڑے ہوئے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو مدینہ منورہ کی ہر گلی میں موجود تھے یا صرف ایک گلی میں تھے اور بقیہ میں نہیں تھے۔ اب ہم علامہ صاحب کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ پہلے کتاب و سنت اور فہمِ سلف صالحین کی روشنی میں اپنے شک کو دور فرمائیں پھر لوگوں کو اپنے عقیدہ کی طرف دعوت دیں۔

استقبال کس کا ہوتا ہے؟

جب علامہ صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا، تو خود بتائیں کہ استقبال کن کا ہوتا ہے؟ کیا جو ہر جگہ حاضر و

ناظر ہو کبھی اس کا بھی استقبال ہوا؟ کیا اللہ تعالیٰ کا کبھی استقبال ہوا ہے؟ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں تو استقبال فضول! اور اگر استقبال صحیح اور درست ہے تو حاضر و ناظر کا عقیدہ غلط ہے!

علامہ صاحب کی پیش کردہ حدیث خود ان کے خلاف ہے:

علامہ صاحب نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ حدیث مسلم شریف جلد دوم میں موجود ہے، لیکن علامہ صاحب نے حدیث کا بالکل آخری جملہ نقل کیا ہے کہ اہلِ مدینہ نے چھتوں پر چڑھ کر "یا رسول اللہ" کہا، اگر علامہ صاحب پوری حدیث پر نگاہ ڈالتے تو اس حدیث کو حاضر و ناظر کی دلیل نہ بناتے، کیونکہ حدیث کے جس ٹکڑے سے علامہ صاحب نے استدلال کیا ہے، اس سے پہلے یہ الفاظ موجود ہیں:

"فتنازعوا ایھم ینزل علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فقال: انزل علی بنی النجار اخوال عبدالمطلب، اکرمھم بذالک!" (صحیح مسلم ج:۲ ص:۴۱۹)

یعنی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اہلِ مدینہ کا اختلاف ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں اُتریں اور کہاں قیام فرمائیں؟ کیونکہ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں قیام فرمائیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں اپنے دادا عبدالمطلب کے ننھیال کے ہاں اُتروں گا اور اس طریقہ سے ان کا اکرام کروں گا!

اب انصاف علامہ صاحب کے ہاتھ میں ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر تھے، اور ان کا یہی عقیدہ تھا، تو اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اور ہر شخص یہ تمنا کیوں کر رہا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں قیام فرمائیں؟ پس معلوم ہوا صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے

موقع پر ''یا رسول اللہ'' کہا، لیکن وہ آپ کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے، حاضر و ناظر اور مختارِ کل کے عقیدہ کے بغیر محبت وشوق میں ''یا رسول اللہ'' کہنے کو کوئی عالمِ دین شرک اور حرام نہیں کہتا۔

علامہ صاحب جزء ''ب'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے دکھ درد دور کرنے کے لئے حضور علیہ السلام کو ''یا'' سے پکارا۔''

اور جزء ''ج'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے دکھ درد کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''یا'' سے پکارا۔''

(نظریاتِ صحابہ ص:۱۷)

الجواب:

علامہ صاحب نے عوام الناس کو دھوکا دینے کے لئے دونوں روایتوں کے مفہوم کو گول مول کردیا، حالانکہ اگر علامہ صاحب ان دونوں روایتوں کا صرف لفظی ترجمہ بھی بیان فرمادیتے تو قارئینِ کرام کے سامنے صحیح صورتِ حال آجاتی، لیکن اس سے علامہ صاحب کا من مانا مطلب پورا نہ ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی من مانی کرنے کے لئے سرے سے روایتوں ہی کو مجمل انداز میں بیان کردیا، تاکہ لوگ سمجھیں کہ واقعی ان دو جلیل القدر صحابیوں نے ''یا محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر آپؐ سے مدد مانگی، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، ہم اصل حقیقت قارئینِ کرام کے سامنے واضح کیے دیتے ہیں۔

سب سے پہلی گزارش یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں ضعیف اور ناقابلِ قبول ہیں، کیونکہ علامہ صاحب نے یہ دونوں روایتیں ابوبکر ابن السنی کی کتاب ''عمل الیوم

واللیل'' اور امام بخاریؒ کی کتاب ''الادب المفرد'' سے نقل کی ہیں، اور ابوبکر ابن السنی کی کتاب ''عمل الیوم واللیل'' کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ ان روایتوں کا راوی ابواسحاق السبیعی ہے، اور وہ مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کر رہا ہے، اور جب راوی مدلس ہو اور عنعنہ سے روایت کرے تو اس کی روایت ناقابل اعتماد ہوتی ہے، اور مزید لکھا ہے کہ ابواسحاق السبیعی اختلاط کا بھی شکار ہے۔ (حاشیہ عمل الیوم واللیل لابن السنی ص:۵۵)

پس جبکہ یہ دونوں روایتیں مخدوش، ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہیں، تو ان سے دلیل پکڑنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ کیونکہ کسی عقیدہ کو ثابت کرنے کے لئے نصوصِ قطعیہ اور احادیثِ متواترہ اور اجماعِ امت کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی تین چیزیں عقائدِ اسلام کی بنیاد ہیں۔ علامہ صاحب خوب جانتے ہیں کہ خبرِ واحد چاہے صحیح سند سے ثابت ہو، لیکن عقیدہ کی بنیاد نہیں بن سکتی، جب تک کہ اس کو اجماعِ امت کی تائید حاصل نہ ہو، ہاں! جب خبرِ واحد صحیح ہو اور اجماعِ امت سے مؤید بھی ہو، تو وہ عقیدہ کی بنیاد بن سکتی ہے، لیکن اگر صرف خبرِ واحد ہو اور اجماعِ اُمت سے اس کو تائید حاصل نہ ہو تو وہ اثباتِ عقائد کے لئے ناکافی ہے۔

تعجب یہ ہے کہ علامہ صاحب اپنا عقیدہ ثابت کرنے کے لئے ضعیف اور مردود روایتوں کا سہارا ڈھونڈ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ صاحب کا دامن نصوصِ قطعیہ، احادیثِ متواترہ اور اجماعِ امت سے یکسر خالی ہے، اسی لئے تو کمزور اور معلول روایتوں سے استدلال کر رہے ہیں، جبکہ ایسی کمزور اور معلول روایتوں سے عقائد قطعاً ثابت نہیں ہوتے۔

اگر بالفرض علامہ صاحب کی پیش کردہ روایتوں کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے، تو پھر بھی یہ روایتیں ان کی دلیل نہیں بن سکتیں، کیونکہ علامہ صاحب نے اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے بات گول مول کی ہے، جس سے عام آدمی کو یہ مغالطہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے ”یا رسول اللہ“ کہہ کر مدد مانگی ہے، لہٰذا ہم اصل حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

کیا حضرت ابن عباسؓ نے دکھ درد دور کرنے کے لئے حضور اکرمؐ سے مدد مانگی؟

اس جعلی عبارت کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، اور اس کا پاؤں سن ہوگیا، تو اس شخص کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ: جو شخص تجھ کو لوگوں میں سے زیادہ پیارا ہو اس کو یاد کر! تو اس شخص نے ”یا محمد!“ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا۔

اور یہی حقیقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے قصہ کی ہے کہ ان کا پاؤں بھی سن ہوگیا تھا، ایک شخص نے ان سے کہا: جو شخص آپ کو لوگوں سے زیادہ پیارا ہو، اس کو یاد کرو! پس انہوں نے ”یا محمدؐ“ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا۔

ان روایتوں کا پسِ منظر:

اُس دور میں جس شخص کا پاؤں سن ہوجاتا تھا، وہ اپنے کسی پیارے شخص کو یاد کرتا، کیونکہ آدمی جب اپنے محبوب کو یاد کرتا ہے، تو اس کا ذہن فوراً اس کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، جس سے آدمی اپنی تکلیف کو بھول جاتا ہے، اور بعض تکالیف ایسی ہوتی ہیں کہ اگر آدمی کا ذہن دوسری طرف منتقل ہوجائے تو وہ خود بخود ختم ہوجاتی ہیں۔ بہرحال یہ ایک قسم کی تجویز تھی جس کے ذریعہ پاؤں کے سن ہونے کا علاج کیا جاتا تھا، نہ کہ پیارے آدمی کو مختارِ کل سمجھ کر اُس سے مدد مانگی جاتی تھی۔

جیسا کہ مذکورہ بالا روایات سے ظاہر ہے کہ جب ایک شخص کا پاؤں سن ہوا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کو فرمایا کہ: اپنے پیارے کو یاد کر! اور جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا پاؤں سن ہوا تو ان کو بھی ایک شخص نے یہی کہا کہ: اپنے پیارے کو یاد کریں!

اگر ان روایات سے مختارِ کل کا مسئلہ نکلتا ہے، تو پھر یہ بھی ثابت ہوگا کہ آدمی کو جس سے پیار ہے، وہ اس کے لئے مختارِ کل ہے، اور اس سے دکھ درد میں مدد مانگنا بھی جائز ہے، حالانکہ حصن حصین جس کا حوالہ خود علامہ صاحب نے بھی دیا ہے، اس میں لکھا ہے کہ:

"واذا خدرت رجلهٔ فلیذکر احب الناس الیه."

(حصن حصین ص:۱۱۳۰، مطبوعہ تاج کمپنی)

یعنی جب آدمی کا پاؤں سن ہو جائے تو لوگوں میں سے جس کے ساتھ زیادہ پیار ہو اس کو یاد کرے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ حصن حصین کے مؤلف علامہ شمس الدین محمد بن محمد الجزری الشافعی رحمہ اللہ ان روایات کو سامنے رکھ کر اُصول بتا رہے ہیں کہ جب بھی پاؤں سن ہو جائے تو کسی پیارے کو یاد کرو۔ کیا علامہ صاحب ہر آدمی کے ہر محبوب کے مختارِ کل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں؟ اور کیا علامہ صاحب کے نزدیک ہر محبوب سے دکھ درد میں مدد مانگنا جائز ہے؟

اگر علامہ صاحب یہ اشکال کریں کہ ٹھیک ہے مشورہ دینے والوں نے یہی مشورہ دیا کہ اپنے پیارے کو یاد کرو، لیکن انہوں نے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا، لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مختارِ کل ہونا اور آپ سے مدد مانگنا ثابت ہو جائے گا۔

جواب یہ ہے کہ یاد کرنے والوں نے صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد نہیں کیا، بلکہ اپنے دوسرے محبوبوں کو بھی یاد کیا ہے، چنانچہ علامہ صاحب نے یہ دونوں واقعے جس کتاب "عمل الیوم واللیل" سے نقل کئے ہیں، اسی کتاب میں لکھا ہے کہ:

"ایک شخص کا پاؤں سن ہو گیا، اس کا پیار عتب نامی شخص سے تھا، چنانچہ اس نے یا عتب کہا، دوسرے شخص نے پاؤں

سن ہوتے وقت اپنی پیاری بیوی کو یاد کیا، تیسرے شخص نے ایسے وقت میں اپنے پیارے بیٹے کو یاد کیا۔"

(عمل الیوم واللیل لابن السنی ص:۵۶)

اب علامہ صاحب وضاحت فرمائیں کہ جب عتب کو بھی "یا" کے ساتھ پکارا گیا تو کیا عتب مختارِ کل بن گیا؟ اور کیا دکھ درد دور کرنے کے لئے "یا عتب" کہنا جائز ہے؟

اور جس شخص نے اپنی بیوی کو "یا" کے ساتھ پکارا، کیا اس کی بیوی بھی مختارِ کل ہوگئی؟ اسی طرح جس نے پیارے بیٹے کو پکارا تو کیا اس کا بیٹا بھی مختارِ کل بن گیا؟

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کبھی بھی دکھ درد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد نہیں مانگی اور نہ ہی یہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختارِ کل کا عقیدہ رکھتے تھے، کیونکہ حضراتِ صحابہؓ کے نفوسِ قدسیہ شرکیہ عقائد سے پاک وصاف ہیں۔

علامہ صاحب کی کم علمی یا بے سمجھی:

علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے دکھ درد دور کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "یا" سے پکارا۔"
(نظریاتِ صحابہؓ ص:۱۷)

اور حوالہ عمل الیوم واللیل لابن السنی کا دیا ہے، جب ہم نے مذکورہ کتاب دیکھی تو وہاں لکھا تھا کہ:

ایک شخص کا پاؤں سن ہوگیا، تو حضرت عبداللہ بن

عباسؓ نے اس کو فرمایا کہ تو اپنے پیارے کو یاد کر، اس شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا، یعنی حضرت ابن عباس نے دکھ درد دور کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''یا'' سے نہیں پکارا، بلکہ ایک اور شخص کو فرمایا کہ: اپنے محبوب کا نام لے! پھر اس شخص نے بھی ''یا'' سے نہیں، بلکہ صرف ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' سے آپ کا ذکر کیا۔''

ا:... علامہ صاحب کہتے ہیں کہ دکھ درد حضرت ابن عباسؓ کو ہوا، حالانکہ پاؤں کسی اور کا سن ہوا۔

۲:... علامہ صاحب کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے ''یا'' سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا، حالانکہ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرنے والا اور شخص ہے۔

۳:... علامہ صاحب کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''یا'' سے پکارا گیا، حالانکہ روایت میں ''یا'' کا حرف موجود نہیں ہے۔

۴:... علامہ صاحب کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگی گئی، حالانکہ محبوب کا نام لے کر ذہن کو دوسری طرف منتقل کیا گیا۔

اس روایت کے متعلق مزید وضاحت:

ہم نے پہلے عرض کر دیا ہے کہ ان دونوں روایتوں کا راوی ابواسحاق السبیعی ہے، جو کہ مدلس ہے، اور روایت بھی عنعنہ سے کرتا ہے، اور مزید یہ کہ یہ شخص اختلاط کا بھی شکار ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کا مزید من گھڑت ہونا بھی ملاحظہ فرمایئے کہ اس روایت کا ایک راوی غیاث بن ابراہیم نخعی ہے، جس کے متعلق محدثین نے لکھا ہے: ''یضع الحدیث''، یعنی یہ شخص حدیثیں گھڑ لیا کرتا تھا۔

(حاشیہ عمل الیوم واللیل لابن السنی ص:۵۵)

قارئینِ کرام! علامہ صاحب کی پیش کردہ روایتوں کی سند، پسِ منظر اور صحیح صورتِ حال آپ کے سامنے ہے، اب فیصلہ خود فرمالیں، اگر ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی!

علامہ صاحب جزء ''ز'' میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت راجز نے (دور سے) حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو مدد کے لئے ''یا'' سے پکارا اور حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی مدد کی۔ حضور نے فرمایا: راجز یستصرخنی، اغثنی یا رسول اللہ۔ یعنی یہ راجز ہے مجھ سے مدد مانگ رہا ہے اور کہتا ہے: اغثنی یا رسول اللہ۔ اللہ کے رسول میری مدد کریں۔'' (نظریاتِ صحابہؓ ص:۱۸)

الجواب باسم ملہم بالصواب:

علامہ صاحب کا پیش کردہ واقعہ حدیث، سیرت اور تاریخ کی مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے، لیکن علامہ صاحب نے اس واقعہ کو مجمل انداز میں پیش کر کے حقائق پر پردہ ڈالنے اور صحیح صورتِ حال کو چھپانے کی کوشش کی ہے، اور وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ اگر وہ صحیح صورتِ حال واضح کردیتے تو ان کا من مانا مطلب پورا نہ ہوتا، اسی لئے علامہ صاحب نے واقعہ کو مجمل بنا کر عام لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی، ہم سب سے پہلے اس راجز کا واقعہ ذکر کرتے ہیں، تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے، واقعہ یہ ہے کہ:

۶ھ میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان ایک صلح ہوئی، جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے، اس صلح نامہ میں پہلی شرط یہ تھی کہ دس سال تک دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے، ایک دوسرے کے دشمنوں اور مخالفوں کا

ساتھ بھی نہیں دیں گے، عرب کے باقی قبائل کو اختیار دیا گیا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدہ کرلیں۔ اور حلیفانہ معاہدہ کا مطلب یہ ہے کہ دو قبیلے آپس میں یہ طے کرلیں کہ ہم صلح اور جنگ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے، ایسے دو قبیلوں کو ایک دوسرے کا حلیف کہا جاتا ہے۔ چنانچہ عرب کے دو قبیلے بنوبکر اور بنوخزاعہ جن کی زمانۂ جاہلیت سے آپس میں دشمنی چلی آرہی تھی، ان دو فریقوں نے اس طرح حلیفانہ معاہدے استوار کئے کہ بنوبکر مشرکینِ مکہ کے حلیف بن گئے، اور بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے۔ صلح حدیبیہ کی وجہ سے جس طرح مسلمان اور مشرکین ایک دوسرے سے مأمون اور محفوظ ہوگئے، اسی طرح بنوبکر اور بنوخزاعہ حلیفانہ معاہدہ کی وجہ سے فریقین سے اور آپس میں ایک دوسرے سے مأمون و محفوظ ہوگئے، لیکن بنوبکر نے غداری اور بدعہدی کی، اپنے حلیف قریشِ مکہ کی مدد سے مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ پر شب خون مارا اور ان کے بیس آدمی قتل کردیئے، تو بنوخزاعہ نے حلیفانہ معاہدہ کے تحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے جنگی امداد مانگی اور معاہدہ کی وجہ سے مسلمانوں پر ان کی امداد ضروری تھی کیونکہ وہ مظلوم تھے، ادھر مشرکین بنوبکر کی امداد کرکے صلح حدیبیہ کے عہد کو توڑ چکے تھے، کیونکہ جن پر شبِ خون مارا گیا تھا وہ مسلمانوں کے حلیف تھے، بنوخزاعہ کے ساتھ غداری اور بدعہدی گویا مسلمانوں کے ساتھ غداری اور بدعہدی تھی، اس مظلومی کی حالت میں بنوخزاعہ کے ایک شخص عمرو بن سالم خزاعی نے اشعار پڑھے جس میں بنوبکر اور مشرکین کی بدعہدی اور غدآری کا ذکر کیا، مسلمانوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکینِ مکہ کے خلاف جنگی مدد طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے معجزۃً اس شخص کی آواز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں صبح کی نماز کا وضو فرما رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لبیک! لبیک! نصرت، ثلاثاً۔ یعنی تیری آواز مجھ تک پہنچ گئی، اب تیری نصرت کی جائے گی، سیدہ

میمونہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے، حالانکہ آپ کے ساتھ دوسرا کوئی آدمی نہیں تھا؟ تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"راجز بنی کعب یَستصرخنی!"

یعنی قریش کی مدد سے بنوبکر نے بنوخزاعہ پر ظلم کیا ہے، اور بنوخزاعہ کا راجز (یعنی شعر پڑھنے والا) مجھ سے جنگی امداد کی درخواست کر رہا ہے، اور میں نے اس کے ساتھ امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر یہی عمرو بن سالم (راجز) اپنے قبیلہ کے چالیس آدمی لے کر مدینہ منورہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور قریش کے ظلم اور اپنی مظلومیت کی داستان سنائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے امداد کی اپیل کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے امداد کا وعدہ فرمایا، چنانچہ انہی مظلوموں کی امداد کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر تیار کیا اور مشرکینِ مکہ پر چڑھائی کی، جس کے نتیجہ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

یہ ہے واقعۂ راجز کی صحیح صورتِ حال، جس پر علامہ صاحب نے پردہ ڈال کر من مانی کرنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ لوگ ایک معاہدہ کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے جنگی تعاون کی درخواست کر رہے تھے اور اسی معاہدہ کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جنگی امداد فرمائی اور قریشِ مکہ کو ظلم اور عہد شکنی کا مزہ چکھایا۔

علامہ صاب نے اس واقعہ کے لئے سات کتابوں سے حوالے دیئے ہیں، جبکہ کسی ایک کتاب میں بھی "اغثنی یا رسول اللہ" کے الفاظ نہیں ہیں، کتنے ظلم کی بات ہے کہ ایک تو علامہ صاحب نے حدیثِ رسولؐ میں اپنی طرف سے ملاوٹ کردی، پھر یہ دھوکا دیا کہ شاید "راجز" کسی شخص کا نام ہے، حالانکہ "راجز" کا معنی ہے شعر پڑھنے والا، ورنہ اس کا نام تو عمرو بن سالم ہے، لیکن جو شخص بھی علامہ صاحب کا رسالہ پڑھے گا وہ یہی سمجھے گا کہ "راجز" کسی شخص کا نام ہے۔

قارئینِ کرام! قبیلہ بنوخزاعہ کے راجز نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکل کشا، حاجت روا اور نفع ونقصان کا مالک اور متصرف فی الامور سمجھ کر مافوق الاسباب مدد طلب نہیں کی، جیسا کہ اس زمانہ میں اہلِ بدعت کرتے ہیں، انہوں نے تو ایک خاص معاہدہ کی بنیاد پر ماتحت الاسباب اعانت کی درخواست کی تھی، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کی صورت میں ان کی امداد فرمائی، یہ تو ایک تعاون ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے: ”وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى، وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ اور یہ وہ امداد ہے جس کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو حکم دیا ہے: ”انصرا اخاک ظالمًا او مظلومًا!“ یعنی اپنے بھائی کی امداد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم! صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مظلوم کی امداد تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن ظالم کی امداد کا کیا مطلب؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ظالم کی امداد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کو ظلم سے روکو!

بہرحال واقعۂ راجز سے علامہ صاحب کا استدلال بالکل باطل ہے، اور ان کا شرکیہ عقیدہ اس سے ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختارِ کل سمجھ کر ”اغثنی یا رسول اللہ“ کہہ کر مافوق الاسباب مدد نہیں مانگ رہے تھے، بنوخزاعہ نے تو ماتحت الاسباب جنگی امداد کی درخواست کی ہے، بلکہ ”الاصابہ“ میں لکھا ہے کہ: یہ قبیلہ بنوخزاعہ اس وقت مسلمان نہیں ہوا تھا، بعد میں مسلمان ہوا۔ اور بعض علماً نے لکھا ہے کہ اس قبیلہ کے بعض لوگ مسلمان ہوچکے تھے اور پورا قبیلہ مسلمان نہیں ہوا تھا، انہوں نے امداد کی درخواست صرف معاہدہ کے تحت کی تھی، اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ان لوگوں کی طرف ”اغثنی یا رسول اللہ“ کی نسبت کرنا، کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے! کیونکہ ایک غیر مسلم ”اغثنی یا رسول اللہ“ کیسے کہہ سکتا ہے، جبکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ہی نہیں مانتا؟

خلاصہ یہ کہ غیر اللہ کو متصرف فی الامور اور نفع ونقصان کا مالک سمجھ کر پکارنا

اور مدد مانگنا شرک ہے، کیونکہ یہ عبادت ہے، اور عبادت کے لائق صرف اللہ ہے، غیراللہ کی عبادت شرک ہے، "**ایاک نعبد وایاک نستعین**" کا یہی مطلب ہے، خیرالقرون میں شرکیہ عقائد و اعمال کا رواج نہیں تھا، وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مشکل کشا، حاجت روا، متصرف فی الامور اور نفع ونقصان کا مالک سمجھ کر مدد نہیں مانگتے تھے، ان لوگوں سے "**اغثنی یا رسول اللہ**"، "یا رسول اللہ مدد"، "یا علی مدد" اور "یا غوث الاعظم مدد" اس طرح کے شرکیہ الفاظ کہنا بالکل ثابت نہیں، خیرالقرون کے لوگ شرک و بدعات سے سخت متنفر تھے اور کوسوں دور۔

"اغثنی یا رسول اللہ" کون کہتے ہیں؟

ہم نے عرض کیا کہ "**اغثنی یا رسول اللہ، ادرکنی یا رسول اللہ**" کہنے کا رواج خیرالقرون میں نہیں تھا، یہ کلمات بعد کی ایجاد ہیں، البتہ بخاری شریف کی ایک حدیث سے "**اغثنی یا رسول اللہ**" کہنے والوں کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم (صحابہ کی جماعت) کو کھڑے ہوکر بیان فرمایا کہ:

> "میں تم میں سے کسی ایک کو ایسا نہ پاؤں کہ قیامت کے دن اُٹھے اور اس کی گردن پر مالِ غنیمت کی چوری کا اُونٹ یا گھوڑا سوار ہو، اور مجھے دیکھ کر کہے: **یا رسول اللہ اغثنی!** (یعنی اے اللہ کے رسول! میری مدد فرما) تو میں کہوں گا: **لا املک لک شیئًا!** (یعنی میں تیرے لئے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا)۔"
>
> (بخاری شریف ج:۱ ص:۴۳۲)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت کی چوری کرنے والے لوگ "**یا رسول اللہ اغثنی**" کہیں گے۔

علامہ صاحب جزء ''س'' میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت خالد بن ولیدؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے مسیلمہ کذاب کی جنگ میں خاص اسلامی علامتی نعرہ مارا اور حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو ''یا'' سے پکارا، حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کے وصال کے بعد اور مدینہ منورہ سے دور صحابہ (کرامؓ) نے یہ نعرۂ رسالت لگایا، **وکان شعارھم یومئذ یا محمداہ!**'' (نظریاتِ صحابہؓ ص:۱۸)

الجواب باسم ملہم الصواب:

لگتا ہے کہ علامہ صاحب کا صرف ایک ہی کام ہے کہ حقائق پر پردہ ڈال کر عوام الناس کو مغالطہ میں ڈالنا اور ان کو دھوکا دینا، چنانچہ اس دلیل میں بھی علامہ صاحب نے حسبِ سابق وہی کچھ کیا جو پہلے کر چکے ہیں۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ مسیلمہ کذاب کے ساتھ مسلمانوں کی جو لڑائی ہوئی، اس جنگ میں مسیلمہ کذاب کے فوجی وہ لوگ تھے جو پہلے مسلمان تھے بعد میں مرتد ہوکر مسیلمہ کذاب کی جماعت میں شامل ہوئے، اسی لئے ان کی شکل وصورت اور وضع قطع مسلمانوں والی تھی، جیسا کہ اس دور میں مرزائی ہیں، ہر ایک مرزائی کی وضع قطع وغیرہ مسلمانوں کی سی ہے، شکل و صورت سے ایک مرزائی اور قادیانی کا مسلمانوں سے امتیاز کرنا بڑا مشکل ہے، اور یہی کیفیت مسیلمہ کذاب کی فوج کی تھی، اُن سے ایک مسلمان کا امتیاز بڑا مشکل تھا، اسی مجبوری کی وجہ سے اس دن مسلمانوں نے اپنا امتیازی نشان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کو بنایا تاکہ مغالطہ میں کہیں اپنا آدمی اپنے ہاتھوں نہ مارا جائے، پس جب ان مرتدین کی لڑائی میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ملتا تو دونوں ایک دوسرے کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر ملتے تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ مسلمان بھائی

ہے، مرتد نہیں ہے، اسی لئے تو علامہ صاحب نے بھی تسلیم کرلیا کہ اس دن یہ مسلمانوں کا علامتی نعرہ تھا، معلوم ہوا کہ خاص وقتی ضرورت کے لئے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام استعمال کیا تاکہ امتیاز ہوجائے۔ لیکن علامہ صاحب لوگوں کو یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ''یا محمداہ'' کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگی، حالانکہ یہ بہتان ہے، صحابہ کرامؓ کے نفوسِ قدسیہ شرک کی تہمت سے پاک اور منزہ ہیں۔ علامہ صاحب جہاں حرفِ ''یا'' دیکھتے ہیں وہاں سے حاضر و ناظر اور مختارِ کل کا مسئلہ کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں، علامہ صاحب کو چاہئے کہ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماعِ امت کے دلائل پیش کریں، حرفِ ''یا'' سے استدلال سوائے خوش فہمی کے کچھ بھی نہیں ہے۔

علامہ صاحب فیصلہ کریں:

علامہ صاحب ''یا محمداہ'' کو خاص اسلامی نعرہ قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے یہی نعرہ مارا، لیکن علامہ صاحب کے پیشوا اور مقتدا حکیم ابوالعلیٰ مولانا محمد امجد علی صاحب اعظمی رضوی لکھتے ہیں:

> ''اگر حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکارے تو نام پاک کے ساتھ ندا نہ کرے کہ یہ جائز نہیں ہے۔''
>
> (بہارِ شریعت حصہ اول ص: ۱۷)

اب فیصلہ علامہ صاحب خود فرمائیں کہ بات آپ کی صحیح ہے یا آپ کے پیشوا اور مقتدا کی؟ علامہ صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ نعرۂ رسالت ''یا محمداہ'' ہے جبکہ مروّجہ نعرۂ رسالت ''یا رسول اللہ'' ہے۔

علامہ صاحب جز [illegible] میں لکھتے ہیں کہ:

''اور نماز میں مدینہ منورہ سے دور رہ کر اور حضور

(اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کے وصال کے بعد بھی صحابہ (کرامؓ) پڑھتے تھے: "السلام علیک ایھا النبی" "ایھا النبی" ندا ہے۔" (نظریاتِ صحابہؓ ص:۱۹)

الجواب:

بلاشبہ ہر مسلمان نماز میں "السلام علیک ایھا النبی" پڑھتا ہے، اور یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غائبانہ خطاب ہے، لیکن غائبانہ خطاب سے حاضر و ناظر کا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا، اور نہ ہی کسی صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھ کر "ایھا النبی" کہا ہے، بلکہ تمام صحابہ کرامؓ اور پوری امت کا عقیدہ ہے کہ دور سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو درود شریف پڑھا جاتا ہے وہ بذریعہ ملائکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاتا ہے، یہ عقیدہ صحاحِ ستہ کی احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، لہٰذا "ایھا النبی" سے علامہ صاحب کا استدلال بھی باطل ہے۔ علامہ صاحب اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھتے ہوں گے اور خط کے مضمون سے پہلے "السلام علیکم" بھی لکھتے ہوں گے، اور "السلام علیکم" بھی خطاب ہے، تو کیا "السلام علیکم" کے خطاب کرنے سے علامہ صاحب کے بزرگ، دوست اور عزیز سب حاضر و ناظر ہو جائیں گے، نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ علامہ صاحب نے خط کی ابتداً میں "السلام علیکم" کا خطاب اس لئے لکھا ہے کہ یہ خط مکتوب الیہ تک پہنچے گا اور اسی وقت خطاب بھی صحیح ہو جائے گا، پس جس طرح علامہ صاحب کو مکتوب الیہ تک سلام پہنچنے کا یقین ہے اسی طرح پوری امت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک سلام پہنچنے کا اس سے زیادہ یقین ہے۔

ہم نے علامہ صاحب کے پیش کردہ دلائل کا فرداً فرداً جواب عرض کر دیا، اگر علامہ صاحب اور ان کی جماعت ان دلائل کے علاوہ کوئی اور دلیل پیش کرے تو ہم

پیشگی اجمالی طور پر اُس کا جواب بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں تاکہ سند رہے۔

کسی صحابیؓ، تابعیؒ، تبع تابعیؒ یا کسی بزرگ یا عالمِ دین سے ''یا رسول اللہ'' کہنا ثابت ہوجائے تو اس سے نہ تو مختارِ کل کا نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہے اور نہ ہی حاضر و ناظر کا، کیونکہ سلف صالحین میں سے کوئی شخص ایسا عقیدہ رکھنے والا نہیں گزرا، بزرگانِ دین نہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے، اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختارِ کل سمجھتے تھے، کیونکہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک فی الصفات ہے، پس مختارِ کل اور حاضر و ناظر کے عقیدہ کے بغیر محبت و اشتیاق میں ''یا رسول اللہ'' کہنا جائز ہے، اس کو کسی نے شرک اور حرام نہیں کہا، اور جن اہل اللہ سے یہ کہنا ثابت ہے وہ اس شرکیہ عقیدہ کے بغیر ہے، لہٰذا حرفِ ''یا'' سے کسی کو دھوکا نہ کھانا چاہئے، چونکہ علامہ صاحب سینہ زوری سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مختارِ کل ہونا اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا ثابت کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا مناسب ہے کہ ہم اختصار کے ساتھ یہ بات واضح کردیں کہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا اور مختارِ کل ہونا اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ ہیں، اور مخلوقات میں سے کوئی فرد بھی ان صفات میں اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ہے، حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہ تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، اور نہ ہی خدائی اختیارات کے مالک ہیں، پہلے حاضر و ناظر کا مسئلہ پیشِ خدمت ہے۔

ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے:

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے چند صفات ایسی ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ موجود اور حاضر و ناظر ہونے پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً **حفیظ**: نگہبان، دیکھنے والا۔ **رقیب**: ہر وقت دیکھنے والا۔ **شہید**: ہر جگہ حاضر۔ **محیط**: ہر چیز کو احاطہ کرنے والا۔ **قریب**: ہر چیز کے نزدیک۔ **بصیر**: ہر چیز کو دیکھنے والا یعنی ناظر۔

علامہ صاحب ان صفات کے معانی اپنے امام احمد رضا خان صاحب کے

ترجمہ ''کنزالایمان'' میں دیکھ لیں، یہ سب اسمائے حسنیٰ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ اور مزید چند آیاتِ بینات بھی ملاحظہ فرمائیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی اس خاص صفت کی مظہر ہیں، ویسے تو اس مسئلہ میں آیات بہت ہیں، لیکن ہم اختصار کی وجہ سے تین آیات پیش کرتے ہیں، آیات پیش کرنے سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، لہٰذا پہلے ایک اُصول ذہن نشین کرلیں تاکہ آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

غلط فہمی کا ازالہ:

اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ایسی بھی ہیں جن کا اطلاق مخلوقات پر بھی ہوتا ہے، مثلاً: سمیع، بصیر، رءوف، رحیم، شاھد، شھید، وغیرہ، لیکن جب یہ صفات اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر بولی جاتی ہیں تو ان کے وہی معانی مراد ہوں گے جو اس کی ذاتِ پاک کے شایانِ شان ہیں، اور جب یہ صفات مخلوقات پر بولی جائیں گی تو وہ معانی مراد ہوں گے جو مخلوق کے حال کے مناسب ہیں، بہرحال خالق و مخلوق پر اطلاق کرتے وقت ایک ہی معنیٰ مراد لینا غلط اور ایسا کرنا شرک ہے، کیونکہ جس معنی میں اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر اور رؤف و رحیم ہیں، مخلوق ایسے معنی میں نہ سمیع و بصیر ہے اور نہ ہی رؤف و رحیم ہے۔

یہ اُصول ہم نے اس لئے عرض کیا تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ لگ جائے کہ جب تم نے ''شھید'' کا معنی ہر جگہ حاضر کیا ہے تو ''شاھد'' کا بھی یہی معنی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''شاھد'' کہا ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہو گئے، ایسا سمجھنا غلطی ہے، ''شاھد'' اور ''شھید'' کے جو معنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اطلاق کرتے وقت مراد ہوں گے وہی معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں مراد نہیں ہو سکتے، ورنہ یہی صفات یعنی ''شاھد'' اور ''شھید'' آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے علاوہ عام لوگوں پر بھی قرآن مجید میں بولی گئی ہیں، کیا قرآن مجید میں جن کو "شاھد، شھید" اور "شھداء" کہا گیا ہے، وہ سب حاضر و ناظر ہو جاتے ہیں؟ نہیں! ہرگز نہیں!

آیاتِ قرآنیہ:

ا:... "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ." (آل عمران:۵)

ترجمہ:... "بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے زمین میں اور نہ آسمان میں۔"

فائدہ:... اس آیت پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کائنات کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

۲:... "وَمَا تَکُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْہُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُھُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْہِ، وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرَ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ." (یونس:۶۱)

ترجمہ:... "اور آپ کسی حال میں ہوں اور من جملہ ان احوال کے آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور تم جو کام بھی کرتے ہو، ہم کو سب کی خبر رہتی ہے، جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو، اور آپ کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہ کوئی چیز اس

سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی چیز بڑی ہے مگر یہ سب کچھ کتابِ مبین میں ہے۔"

فائدہ:... اس آیتِ پاک سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ علم کے ساتھ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو دیکھتا ہے، اور کوئی چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۳:... "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا....." (المجادلۃ:۷)

ترجمہ:... "کیا آپ نے اس پر نظر نہیں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو، اور نہ پانچ کی ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو، اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ، مگر وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

فائدہ:... یہ آیتِ پاک اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کے ساتھ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کی واضح دلیل ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں ہیں:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جتنا عرصہ جہانِ دنیا میں رہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک ہی جگہ جلوہ افروز ہوتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں ہوتے تو مدینہ منورہ میں نہیں ہوتے تھے، اور جب مدینہ منورہ میں ہوتے تو اس

وقت مکہ مکرمہ میں نہ ہوتے تھے، اور جب آپ معراج پر تشریف لے گئے تو اس وقت نہ آپ مکہ میں تھے اور نہ مدینہ میں، بہرحال آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ ہوتے تھے، ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں ہوتے تھے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا اور دارِ دنیا سے رحلت فرما کر دارِ آخرت میں تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم روضۂ اطہر میں تشریف فرما ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کو بہ تعلقِ روح حیات حاصل ہے، اسی حیات کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزارِ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا صلوٰۃ و سلام سنتے ہیں، یہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اجماعی عقیدہ ہے، لیکن وفات کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر اور موجود نہیں ہیں، قرآن مجید کی تین آیات مشت نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیں:

ا:... "وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَا اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ." (القصص:۴۴)

ترجمہ:... "اور آپ (اے پیغمبرؐ) مغربی جانب موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ کو اَحکام دیئے تھے اور آپ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو موجود تھے۔"

فائدہ:... اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام دیئے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود نہیں تھے۔ "وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ" کا ترجمہ علامہ صاحب کے امام احمد رضا خان نے یوں کیا: "(اے سید الانبیاؑ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُس وقت تم حاضر نہ تھے۔" (کنز الایمان بمع حاشیہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے "شاهدًا" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کو علامہ صاحب کی برادری حاضر و ناظر کی دلیل بناتی ہے، لیکن ان کے امام صاحب نے "وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ" کا ترجمہ "اُس وقت تم حاضر نہ تھے" کر کے مسئلہ حل کر دیا ہے۔ ہمیں مزید عرض

کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲:... ”ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْکُرُوْنَ.“

(یوسف:۱۰۲)

ترجمہ:... ”(اے پیغمبرؐ) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے، ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں، اور آپ ان کے پاس اُس وقت موجود نہ تھے جبکہ انہوں نے اپنا ارادہ پختہ کرلیا تھا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے۔“

فائدہ:... اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب برادرانِ یوسفؑ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف تدبیریں کیں اور ان کو کنویں میں ڈالنے کا پختہ ارادہ کرلیا تو اے پیغمبر! آپ اُس وقت موجود اور حاضر و ناظر نہ تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں ہیں۔

۳:... ”ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ.“ (آل عمران:۴۴)

ترجمہ:... ”یہ قصے من جملہ غیب کی خبروں کے ہیں، ہم اُن کی وحی بھیجتے ہیں آپ کے پاس، اور آپ اُن لوگوں کے پاس نہ اُس وقت موجود تھے جبکہ وہ اپنے قلموں کو ڈالتے تھے کہ ان سب میں کون شخص مریم کی کفالت کرے، اور نہ آپ اُن کے پاس اُس وقت موجود تھے جبکہ وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔“

فائدہ:... اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر فرماتے ہیں کہ: اے میرے پیغمبر! کہ جب بیت المقدس کے علماً اور درویش آپس

میں اختلاف کر رہے تھے اور قرعہ اندازی کے لئے اپنے قلم دریا میں ڈال رہے تھے کہ بی بی مریم کی کفالت کون کرے؟ آپؐ اس وقت موجود نہیں تھے، یعنی اُس وقت آپؐ وہاں حاضر و ناظر نہیں تھے۔

اس مسئلہ میں احادیثِ صحیحہ کا بھی ایک ذخیرہ موجود ہے، لیکن ہم انہیں آیات پر اکتفا کرتے ہوئے چند چیزیں علامہ صاحب کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ ان میں غور وفکر کریں۔

۱:...اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت کا کیا مطلب؟

۲:...آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج کے کیا معنی؟

۳:...ازواجِ مطہراتؓ کے لئے تقسیم بندی کا کیا فائدہ؟

۴:...غزوہ اور سریہ میں فرق کیسا؟

۵:...قرآنی سورتوں کی مکی اور مدنی میں تقسیم کیوں؟

۶:...صحابی اور تابعی میں فرق کیوں؟

۷:...سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرۂ مبارکہ کی دوسرے مکانوں پر فضیلت کیسی؟

ان تمام سوالات کے جوابات علامہ صاحب پر رہتی دُنیا تک قرض رہیں گے۔

اس کے بعد مسئلۂ مختارِ کل کی مختصر تحقیق ملاحظہ فرمائیں!

سارے اختیارات کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے:

قرآن مجید کی سینکڑوں آیات میں سے صرف تین آیات آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سارے اختیارات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں، اور ان اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے:

۱:... ”قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ، بِیَدِکَ الْخَیْرُ، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ، وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ، وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ.“ (آل عمران:۲۷)

ترجمہ:...”(اے پیغمبر!) آپ یوں کہئے کہ اے اللہ! مالک تمام ملک کے، آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں، اور جس سے چاہیں لے لیتے ہیں، اور جس کو آپ چاہیں غالب کردیتے ہیں، اور جس کو آپ چاہیں پست کردیتے ہیں، آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ آپ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔ آپ رات کو دن میں داخل کردیتے ہیں، اور دن کو رات میں داخل کردیتے ہیں، اور آپ ہر جاندار چیز کو بے جان چیز سے نکال لیتے ہیں، اور بے جان چیز کو جاندار چیز سے نکال لیتے ہیں، اور آپ جس کو چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں۔“

۲:... ”اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ، تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ.“ (الاعراف:۵۴)

ترجمہ:...”یاد رکھو! اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا۔“

۳:... ”مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَھَا، وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْ ۢ بَعْدِہٖ،

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ.“ (فاطر:۲)

ترجمہ:... ”اللہ تعالیٰ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دے سو اُس کا کوئی بند کرنے والا نہیں، اور جس کو بند کردے سو اُس کے بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں، اور وہی غالب حکمت والا ہے۔“

فائدہ:... ان تینوں آیات کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ کائنات کے سارے اختیارات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، اور وہ اکیلا اِس کارخانۂ قدرت کو چلانے والا ہے، وہی خالق ہے، وہی مالک ہے اور وہی مدبرِ کائنات ہے، اُس کے کاموں میں اُس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اُس نے تمام اختیارات اپنے پاس رکھے ہیں، اُس نے اپنے اختیارات اپنے پیاروں میں تقسیم نہیں کئے، بلکہ اُس کے پیارے بھی اُس کے حکم کے پابند اور تابع ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختارِ کل نہیں ہیں:

قرآن مجید کی آیاتِ کثیرہ سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدائی اختیارات کے مالک نہیں ہیں، ان میں سے ہم صرف تین آیات پر اکتفا کرتے ہیں:

۱:... ”قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ.....“ (الانعام:۵۰)

ترجمہ:... ”(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا تعالیٰ کے خزانے ہیں، اور نہ میں تمام غیبوں کو جانتا ہوں، اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں

فرشتہ ہوں، میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے اس کا
اتباع کرلیتا ہوں۔"

فائدہ:... اس آیتِ پاک میں اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوا رہے ہیں کہ آپؐ اعلان کردیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک نہیں ہوں، میں تو وحیٔ الٰہی کا تابعدار ہوں، یعنی مالک اللہ ہے، میں مالک نہیں ہوں۔

۲:... "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ." (آل عمران:۱۲۸)

ترجمہ:... "(اے پیغمبر!) آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہوجاویں اور یا ان کو کوئی سزا دے دیں، کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں۔"

فائدہ:... مشرکین مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی مقدس جماعت پر جو ظلم کئے تو آپؐ نے ان پر بددعا کا ارادہ کیا یا بددعا شروع فرمادی، تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو روک دیا کہ آپؐ اس معاملہ میں دخل نہ دیں، کیونکہ یہ معاملہ آپؐ کے اختیار میں نہیں ہے، یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اس کی مرضی ان کو توبہ کی توفیق بخشے یا اُن کو سزا دے، هٰكذا قال المفسرون!

اور علامہ صاحب کے امام احمد رضا خان صاحب "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ" کا معنیٰ کرتے ہیں کہ: "یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں!" اور شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ: "تیرا اختیار کچھ نہیں!" بہرحال اس آیتِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختارِ کل نہیں ہیں۔

۳:... "اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ، وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ." (القصص:۵۶)

ترجمہ:... "(اے پیغمبر!) آپ جس کو چاہیں ہدایت

نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے، اور ہدایت پانے والوں کا علم اُسی کو ہے۔‘‘

فائدہ:... اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت دینا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں (ہدایت دینا) نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام دعوت و تبلیغ کرنا ہے۔

یاد رہے اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس ہدایت کی نفی کی گئی ہے، اُس سے مراد منزلِ مقصود تک پہنچا دینا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سیدھی راہ دکھلانے کی وجہ سے ہادیٔ عالم ہیں۔

اس مسئلہ کی تحقیق میں آیاتِ کثیرہ اور بے شمار احادیثِ صحیحہ پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن ہم انہی تین آیات پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن چند چیزیں علامہ صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔

۱:... اہلِ سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعتِ کبریٰ کا مقام عطا فرمائیں گے، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ’’شفیع المذنبین‘‘ کہا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت برحق ہے، لیکن علامہ صاحب کے دعویٰ کے مطابق اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختارِ کل ہیں تو شفاعت کا کیا مطلب؟ کیونکہ جو سفارش کرتا ہے وہ مختارِ کل نہیں ہوتا، اور جو مختارِ کل ہوتا ہے وہ شفاعت نہیں کرتا۔

۲:... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے من جملہ القاب میں سے ایک لقب ’’عبد‘‘ کا بھی ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند تھا، کیا ہم علامہ صاحب سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب میں سے کوئی لقب ’’مختارِ کل‘‘ کا بھی پایا جاتا ہے؟ کیا ’’عبد‘‘ اور ’’مختارِ کل‘‘ آپس میں جمع ہوسکتے ہیں...؟

نمبر۳:... علامہ صاحب اس نمبر میں لکھتے ہیں:

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کا نام سن کر انگوٹھے چومے، اب جو لوگ حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام سن کر انگوٹھے چومنے کو ناجائز، حرام اور بدعت کہتے ہیں، وہ حضرت صدیق (رضی اللہ عنہ) کے منکر ہیں۔''

(نظریاتِ صحابہؓ ص:۲۰)

الجواب:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ تعلیم دی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی ذکر کیا جائے تو درود شریف پڑھا کرو، یہ بات احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، لیکن کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے چومنے کا حکم دیا ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے بھی کسی صحیح سند کے ساتھ انگوٹھے چومنا ثابت نہیں ہے۔

علامہ صاحب نے روایتِ مذکورہ بالا کے جتنے حوالے دیئے ہیں، ان سب کتابوں میں اس روایت کے متعلق لکھا ہے: ''لم یصح!'' یعنی انگوٹھے چومنے کی یہ روایت صحیح نہیں ہے، کمال افسوس ہے کہ علامہ صاحب نے ان سب کتابوں سے یہ روایت تو نقل کردی ہے، لیکن محدثین کا یہ فیصلہ نقل نہیں کیا کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ ظاہر بات ہے اگر علامہ صاحب ''لم یصح!'' کا جملہ بھی نقل کردیتے تو لوگوں کو دھوکا دینا مشکل ہوجاتا، اسی لئے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے ''لا یصح!'' کا جملہ شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کرگئے اور لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ مثلاً: موضوعاتِ کبیر، حاشیہ جلالین، ردالمختار، طحاوی وغیرہ، کتابوں میں انگوٹھے چومنے کی یہ روایت بھی موجود ہے، اور ساتھ ہی محدثین کے فیصلے ''لا یصح، لم یصح، بسند فیہ مجاھیل، موضوع'' وغیرہ، کے الفاظ کے ساتھ موجود ہیں، چنانچہ بعض محققین نے علامہ جلال

الدین سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب ''تیسیر المقال'' سے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:

''الاحادیث التی رویت فی تقبیل الانامل وجعلها علی العینین عند سماع اسمہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المؤذن فی کلمۃ الشھادۃ کلھا موضوعات.''

یعنی مؤذن سے کلمۂ شہادت سن کر انگلیوں کو آنکھوں پر رکھنے اور چومنے کی تمام روایتیں موضوع ہیں، پس جبکہ انگوٹھے چومنے کی جملہ روایات غیر صحیح، ضعیف، کمزور، معلول، بلکہ موضوع ہیں تو اُن سے استدلال کرنا خود باطل ہے، جب ایک چیز سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے ثابت نہیں تو نامعلوم علامہ صاحب ایک غلط نظریہ کی نسبت ان کی طرف کیوں کر رہے ہیں...؟

علامہ صاحب نے در پردہ ان روایات کا مخدوش اور کمزور ہونا تسلیم کرلیا

علامہ صاحب نے جن کتابوں سے یہ روایت نقل کی ہے، انہیں کتابوں میں محدثین کا یہ فیصلہ بھی ساتھ لکھا ہوا تھا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، چونکہ محدثین کا یہ فیصلہ علامہ صاحب کے مدعا و مقصد کے بالکل خلاف تھا، اسی لئے علامہ صاحب نے کسی کتاب سے یہ جملہ: ''وبمثلہ یُعمَل فی الفضائل'' نقل کر کے اپنی کتاب کے حاشیہ پر لکھ کر گلوخلاصی کی کوشش کی، یعنی علامہ صاحب کا اس جملہ سے مقصد یہ ہے کہ اگرچہ یہ روایت صحیح تو نہیں ہے، بلکہ ضعیف، کمزور اور مخدوش ہے، لیکن ایسی ضعیف روایتوں پر عمل کرنے کی گنجائش اور اجازت ہے۔

بہرحال علامہ صاحب نے ان روایتوں کا ضعف در پردہ تسلیم کرلیا، لیکن بہانہ یہ پیش کیا کہ فضائل کے معاملہ میں ضعیف روایتوں پر عمل کرنے کی گنجائش ہوتی

ہے، اسی لئے اس پر عمل کرنا جائز اور مباح ہے۔

جواباً عرض ہے کہ محدثین کرامؒ نے ضعیف روایت پر عمل کرنے کی چند شرائط مقرر کی ہیں، اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس روایت کا ضعف خفیف قسم کا ہو، لیکن انگوٹھے چومنے کی روایات کا ضعف شدید قسم کا ہے حتی کہ بعض علماً نے تو ان کو موضوع تک بھی کہہ دیا ہے، بہرحال یہ روایتیں ضعفِ شدید کی وجہ سے قابلِ عمل نہیں ہیں۔

لیکن برسبیل تنزل اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ ان روایتوں سے جوازِ عمل ثابت ہوتا ہے تب بھی علامہ صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ فقہائے احناف کا یہ مسلّمہ ضابطہ ہے کہ اگر لوگ کسی جائز اور مباح کام کو ضروری سمجھنے لگیں تو اس کو چھوڑ دینا لازم ہے اور اس پر عمل کرنا مکروہ ہے، دیکھئے فتاویٰ عالمگیریہ جلد:۱ صفحہ:۱۳۶، شامی جلد:۱ صفحہ:۵۷۷۔

چونکہ علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری انگوٹھے چومنے کو ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ فرض سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں، حتی کہ فرض کے تارک کو اتنی ملامت نہیں کرتے جتنی انگوٹھے نہ چومنے والے کو کرتے ہیں، بلکہ اس کو شعائرِ دین سے خیال کرتے ہیں، پس جبکہ ایک غیر ضروری چیز کو ضروری سمجھا جارہا ہے، تو علمائے احناف اور فقہائے اُمت کے مسلّمہ اُصول کے تحت اس کو چھوڑنا چاہئے، کیونکہ ایسے وقت میں اس پر عمل کرنا مکروہ ہے، اگرچہ علامہ صاحب نے ایک اُصول کے تحت جوازِ عمل کی گنجائش نکالی ہے، لیکن دوسرے اُصول کے تحت اس میں کراہت داخل ہوگئی ہے۔

دعوتِ غور وفکر:

علامہ صاحب کو اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہے، تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک کو چومیں، اپنے انگوٹھوں کے چومنے سے کیا فائدہ؟ آدمی کے انگوٹھے تو ہر وقت آدمی کے ساتھ رہتے ہیں، اور آدمی کے ہر عمل میں شریک رہتے ہیں، نامعلوم ان ہاتھوں سے آدمی کیا کچھ کرتا ہے؟ پس ان کے چومنے سے کیا حاصل؟ اور کیا فائدہ؟ لہٰذا علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری کو چاہئے کہ انگوٹھوں کو منہ پر رکھنے کے بجائے درود شریف پڑھ لیا کریں، **ذالک خیر مما یعملون!**

نمبر۴:... علامہ صاحب اس نمبر میں لکھتے ہیں:

"حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو اور حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) کو عبد کوئے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بتایا:

گفت ما دو بندگاں کوئے تو
کردش آزاد ہم بروئے تو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کا عبد بتایا: "**فکنت عبدہٗ وخادمہٗ**" اب جو لوگ عبدالنبی، عبدالرسول، عبدالمصطفیٰ کے ناموں پر شرک کا فتویٰ دیتے ہیں، وہ درحقیقت فاروقِ اعظم اور صدیقِ اکبر کو مشرک (معاذ اللہ) کہہ کر گستاخِ صحابہ بنتے ہیں۔"

(نظریاتِ صحابہؓ ص:۲۰)

الجواب:

قارئینِ کرام! علامہ صاحب ان روایات سے عبدالنبی، عبدالرسول اور عبدالمصطفیٰ وغیرہ جیسے نام رکھنا ثابت کرنا چاہتے ہیں، لیکن علامہ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ صحیح مسلم یہ حدیث موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اچھے نام دو ہیں، جس میں عبد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے، مثلاً: عبداللہ، عبیداللہ، عبدالرحمٰن، عبدالستار وغیرہ۔ علماً فرماتے ہیں کہ دوسرے نمبر پر دو نام اچھے ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک شامل ہوں جیسے محمد احمد، حسین احمد وغیرہ، اور اگر اللہ و رسول کے دونوں ناموں کو شامل کیا جائے تو پھر سونے پر سہاگہ ہوگا، مثلاً: محمد احمداللہ، محمد عبیداللہ، محمد حامداللہ وغیرہ، اس کے باوجود علامہ صاحب ایسے ناموں کو کیوں رواج دینا چاہتے ہیں جن سے شرک کی بو آنے لگے؟ حالانکہ علامہ صاحب کی جماعت کو عشقِ مصطفیٰ کا دعویٰ ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تو عبداللہ اور عبدالرحمٰن جیسے ناموں کو پسند فرماتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا دَم بھرنے والے عبدالنبی اور عبدالمصطفیٰ اور اس قسم کے ناموں کو پسند کرتے ہیں، واللہ اعلم! یہ کیسی محبت ہے...؟ اور یہ کیسا عشق ہے...؟

قرآن میں ایسے ناموں کو پسند نہیں کیا گیا:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

”مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ.“ (آل عمران:۷۹)

ترجمہ:... ”کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرماویں پھر وہ لوگوں کو کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، لیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب

سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ تم پڑھتے ہو۔"

اس آیت پاک سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ کسی نبی اور رسول کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ لوگوں کو کہے کہ میرے بندے بنو، بلکہ ان کی تعلیم تو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنو۔ اب پیغمبروں کی تعلیم کو بھی دیکھو کہ وہ فرما رہے ہیں کہ ہمارے بندے نہ بنو، بلکہ اللہ کے بندے بنو، لیکن اس کے باوجود علامہ صاحب سینہ زوری کر رہے ہیں کہ "عبدالرسول" (رسول کے بندے)، "عبدالنبی" (نبی کے بندے)، "عبدالمصطفیٰ" (مصطفیٰ کے بندے) بنو۔ اسی آیت پر مفتی نعیم الدین صاحب مرادآبادی کا حاشیہ بھی ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

"ابورافع یہودی اور سید نصرانی نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: یا محمدؐ! آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو ربّ مانیں؟ حضورؐ نے فرمایا: اللہ کی پناہ! کہ میں غیراللہ کی عبادت کا حکم کروں، نہ مجھے اللہ نے اس کا حکم دیا، نہ مجھے اس لئے بھیجا۔"

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ناموں سے منع فرمایا:

حدیث شریف میں ہے:

"عن ابی ہریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یقولَنَّ احدکم عبدی وامتی، کلکم عبیدالله و کل نساءکم اماء الله، ولٰکن یقول: غلامی وجاریتی." (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم ص:۴۰۷)

ترجمہ:... "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم میں سے

کوئی شخص اپنے غلام اور لونڈی کو ''عبدی'' اور ''اَمتی'' کہہ کر ہرگز نہ بلائے، (اپنے غلام اور باندی کو ''میرا بندہ'' نہ کہے) کیونکہ تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری تمام عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں، بلکہ ''میرا غلام'' یا ''خادم'' و ''خادمہ'' کہہ کر بلائے۔''

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عبد'' کی نسبت غیر اللہ کی طرف پسند نہیں تھی، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نسبت سے منع فرمادیا، کیونکہ مشرکین اپنے بچوں کے نام ایسے رکھتے تھے جس میں ''عبد'' کی نسبت غیر اللہ کی طرف ہوتی تھی، مثلاً: عبدالعزیٰ، عبدیغوث، عبدالمناۃ وغیرہ، لہٰذا ''عبد'' کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا اسلامی روایت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی صحابی یا تابعی یا تبع تابعی نے اپنی اولاد کا نام ''عبدالرسول'' یا ''عبدالنبی'' یا ''عبدالمصطفیٰ'' نہیں رکھا، بلکہ خیر القرون میں ایسے نام والا کوئی شخص آپ کو نہیں ملے گا۔

باقی رہا یہ سوال کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ''عبد'' کیوں کہا؟ جیسا کہ علامہ صاحب نے نقل کیا ہے۔

تو جواباً عرض ہے کہ علامہ صاحب کی پیش کردہ دونوں روایتیں بے سند ہیں، اگر سند ہوتی تو معلوم ہوتا کہ سند قابلِ احتجاج ہے یا نہیں؟ بر سبیل تنزل اگر سند کو قابلِ احتجاج بھی تسلیم کرلیا جائے تو علامہ صاحب کا اس سے استدلال پھر بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ ''عبد'' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک ''عبد'' بمعنی عبادت کرنے والا، اور دوسرا ''عبد'' بمعنی خادم، اگر ''عبد'' بمعنی عبادت کرنے والا مراد لیا جائے اور پھر نسبت غیر اللہ کی طرف کی جائے تو یہ شرکِ صریح ہے، اس کے شرک ہونے میں ذرّہ بھر بھی شک نہیں ہے، کیونکہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے، لہٰذا بندہ کو ''عبداللہ'' ہونا چاہیئے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا، ''عبدالرسول'' اور ''عبدالنبی'' یعنی رسول و

نبی کی عبادت کرنے والا نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس معنی میں کسی کو ''عبدالرسول'' اور ''عبدالنبی'' کہنا حرام، شرک اور قطعاً ناجائز ہے، اور اگر ''عبدالرسول'' اور ''عبدالنبی'' بول کر رسول اور نبی کا خادم مراد لیا جائے تو یہ اگرچہ شرک تو نہیں ہے لیکن ایسے نام رکھنے سے ایہامِ شرک ضرور ہوتا ہے، اور ایہامِ شرک سے بھی بچنا لازمی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ:

''استفتاء:... کسی کا نام عبدالرسول یا عبدالحسین وغیرہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

ھو المصوب:... ایسا نام جس میں اضافت ''عبد'' کی طرف غیرِ خدا کی ہو شرعاً درست نہیں ہے، اور اگرچہ صرف اس قسم کے نام رکھنے سے حکم شرک کا نہ ہو بسبب احتمال اس کے کہ ''عبد'' سے مراد خادم و مطیع ہے، مگر بوئے شرک سے ایسا نام رکھنا خالی نہیں ہے، قرآن و حدیث اس قسم کے نام رکھنے کی مخالفت پر دال ہیں اور علمائے اُمتِ محمدیہ نے جابجا اس کی تصریح کی ہے۔'' (مجموعہ فتاویٰ ج:۲ ص:۳۲۷)

معلوم ہوا کہ ''عبدالرسول'' اور ''عبدالنبی'' کا مجازی معنی خادم مراد لیا جائے تو تب بھی ایسا نام رکھنا شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں ایہامِ شرک ہے۔

علامہ صاحب کا حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کے قول سے استدلال اس لئے صحیح نہیں، کیونکہ انہوں نے اپنا نام ''عبدالمصطفیٰ'' نہیں رکھا، اور اگر اپنے آپ کو مصطفیٰ کا ''عبد'' کہا ہے تو صرف ایک آدھ دفعہ کہا ہے اور ایسے دور میں کہا ہے جس میں شرک کا قلع قمع ہوچکا تھا اور اس وقت ایہامِ شرک کا خطرہ بھی نہیں تھا، لہٰذا ایک آدھ دفعہ اپنے آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ''عبد'' بمعنی خادم کہنا اور ایہامِ شرک سے منزہ دور میں کہنا مستقل نام رکھنے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اگر علامہ صاحب کا استدلال

صحیح ہے اور ''عبدالمصطفیٰ'' نام رکھنا ''نظریۂ صحابہ کرام'' ہے اور صحابہ ایسے ناموں کو جائز سمجھتے تھے تو صحابہ کرامؓ نے اپنی اولادوں کے لئے ایسے نام تجویز کیوں نہیں کئے؟ حضراتِ شیخینؓ نے اپنے بیٹوں کے نام ''عبدالرسول'' اور ''عبدالنبی'' کیوں نہیں رکھے؟ اگر ایسے نام رکھنا صحابہ کرامؓ کا ''نظریہ'' ہوتا تو وہ ضرور ایسے ناموں کو خیرالقرون میں رواج دیتے، کیونکہ ان کے دلوں میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بدرجہ اتم موجود تھی، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پکے خادم تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے کسی بچے کا نام ''عبدالمصطفیٰ'' نہیں رکھا ہے، لیکن ادھر علامہ صاحب خواہ مخواہ ایسے ناموں کو ''نظریاتِ صحابہ'' میں شامل کر رہے ہیں، اگر علامہ صاحب میں ہمت ہے تو کسی ایک صحابی کے بچے کا نام ''عبدالنبی''، ''عبدالرسول''، ''عبدالمصطفیٰ'' ثابت کردیں، دیدہ باید، پس شیخین رضی اللہ عنہما کے قول سے علامہ صاحب کا استدلال باطل ہے۔

نمبر۵:... علامہ صاحب اِس نمبر پر لکھتے ہیں:

> ''حضرت سواد بن قارب (رضی اللہ عنہ) صحابی کا عقیدہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کل غیب جانتے ہیں:
>
> **''فاشهد انّ اللہ لا رَبَّ غیرہٗ وانک مأمون علیٰ کل غائب''** پس میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی رَبّ نہیں اور (یارسول اللہ) آپ ہر غیب پر مأمون ہیں۔''
>
> (نظریاتِ صحابہ ص:۲۰)

الجواب:

علامہ صاحب اور ان کی جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''عالم الغیب'' ہیں، اور کل غیب جانتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عالم

الغیب سمجھنا شرک فی الصفات ہے، علمِ غیب اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو غیب دان کہنا شرک اور کفر ہے، چنانچہ تمام فقہائے کرام نے اس کی تصریح کی ہے۔ علامہ صاحب نے اپنے رسالہ میں لوگوں کو یہ دکھانا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہماری طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب جانتے تھے، لیکن یہ ناممکن بات ہے کہ کسی صحابی سے یہ شرکیہ عقیدہ ثابت ہوجائے، چنانچہ علامہ صاحب نے بڑی کوشش کی کہ صحابہ کرامؓ سے یہ عقیدہ دستیاب ہوجائے اور میں اس کو ''نظریاتِ صحابہ'' میں شامل کردوں، لیکن یہ جب اپنے مقصد میں ناکام ہوئے تو حضرت سواد بن قارب رضی اللہ عنہ کے ایک شعر کا غلط مطلب بیان کرکے یہ غلط نظریہ ان کے سر تھوپ دیا، سچ کہتے ہیں دانا: ''کھودا پہاڑ... نکلا چوہا... وہ بھی مرا ہوا'' ایڑی چوٹی کا زور لگا کر صرف ایک صحابی کے شعر سے وہ بھی مطلب بگاڑ کر عقیدۂ علم غیب کشید کیا گیا اور اس کا نام رکھا گیا ''نظریاتِ صحابہ'' ...سبحان اللہ... علامہ صاحب نے جو بھی نظریاتِ صحابہ بیان کئے ہیں سب کا یہی حال ہے۔ قرآن مجید کی سینکڑوں آیات اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہزاروں احادیث دلالت کرتی ہیں کہ علمِ غیب اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، اس میں اس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے، ہاں! اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب کی بعض چیزوں کی اطلاع بذریعۂ وحی اپنے نبیوں اور رسولوں کو کردیتے ہیں، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

۱:... ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ.'' (آل عمران:۱۷۹)

ترجمہ:... ''اور اللہ تعالیٰ ایسے اُمورِ غیبیہ پر تم کو مطلع نہیں کرتے، ولیکن ہاں جس کو خود چاہیں اور وہ اللہ کے پیغمبر ہیں اُن کو منتخب فرماتے ہیں۔''

۲:... ''عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا.

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا۔" (الجن:۲۷)

ترجمہ:... "غیب کا جاننے والا وہی ہے، سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، ہاں! اگر ایسے کسی برگزیدہ پیغمبر کو تو اُس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے۔"

۳:... "تِلْکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْھَآ اِلَیْکَ مَا کُنْتَ تَعْلَمُھَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا...."

(ہود:۴۹)

ترجمہ:... "یہ قصہ من جملہ اَخبارِ غیب کے ہے، جس کو ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچادیتے ہیں، اس کو اِس سے قبل نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔"

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو بعض اُمورِ غیبیہ پر مطلع فرماتے ہیں، ایک نبی کو بحیثیتِ نبی ہونے کے جن علوم کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ وہ علوم اُن کو عطا فرماتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو علوم نبی و رسول کے شایانِ شان ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اُن کو عطا کئے جاتے ہیں، اور جو علوم نبی و رسول کے شایانِ شان نہیں ہوتے، وہ عطا نہیں کئے جاتے اور نہ ہی ایسے علوم کی نبی و رسول کو بحیثیتِ نبی و رسول کے ضرورت ہوتی ہے۔

علامہ صاحب کا یہ سمجھنا کہ "اللہ تعالیٰ کے پاس جتنے علوم ہیں وہ سارے کے سارے پیغمبر کو عطا کردیئے جاتے ہیں، پس اللہ اور اُس کے رسول کا علم برابر ہوجاتا ہے، صرف ذاتی اور عطائی کا فرق باقی رہ جاتا ہے"، یہ ان کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ خالق اور مخلوق کی کسی صفت میں برابری اور ہمسری نہیں ہوسکتی۔ اگر ساری مخلوقات کے علوم بھی جمع کردیئے جائیں تو ان سب کے علوم کو اللہ تعالیٰ کے علم کے

ساتھ وہ نسبت بھی نہیں ہوگی جو ایک قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔ "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ" اور "لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اس کا ہمسر کوئی بھی نہیں ہے، ہاں! اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو بعض غیوب پر مطلع فرماتے ہیں، کل غیب کا مالک صرف اللہ ہے، اور غیبِ کلّی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور نہ ہی وہ اپنی ذات اور صفات میں کسی قسم کی شرکت برداشت کرتا ہے، "سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ"، "تعالی اللہ الملک الحق"، خود قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض غیوب کی اطلاع نہیں دی، مثلاً: ارشاد فرمایا:

"وَمَا عَلَّمْنٰـہُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ." (یٰسٓ:۶۹)

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ہم نے اپنے پیغمبر کو شاعری کا علم نہیں دیا، اور وہ آپ کے شایانِ شان بھی نہیں تھا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

"مِنْھُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ وَمِنْھُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ."

یعنی اے پیغمبر! بعض نبیوں کے قصے ہم نے آپ پر بیان کئے اور بعض نبیوں کے قصے آپ پر بیان نہیں کئے۔

اسی طرح قرآن مجید میں بار بار مشرکینِ مکہ کا یہ سوال دُہرایا گیا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمیشہ لاعلمی کا اظہار کیا گیا، مثلاً: "اِلَیْہِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ" یعنی قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے، "عِلْمُھَا عِنْدَ رَبِّیْ" یعنی قیامت کا علم میرے ربّ کے پاس ہے۔ "اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ" یعنی قیامت کی حتمی تاریخ مجھے معلوم نہیں ہے۔ بہر حال آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کل غیب عطا نہیں کیا گیا، مثلاً: بعض نبیوں کے قصے بتائے گئے لیکن بعض نبیوں کے نام اور حالات

کی اطلاع نہیں دی گئی، شعر و شاعری کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہیں تھا، اسی لئے یہ علم بھی آپ کو عطا نہیں کیا گیا، اسی طرح قیامت کی حتمی تاریخ بمع سنہ کے آپ کو نہیں بتلائی گئی۔

اطلاعِ غیب اور علمِ غیب میں فرق ہے:

بہرحال قرآن مجید میں یہ بات صراحت اور وضاحت کے ساتھ ثابت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب کی بہت سی باتوں پر اپنے برگزیدہ بندوں کو مطلع فرماتے ہیں، جس میں کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن غیب کی جن باتوں کو پیغمبروں کے سامنے منکشف کیا جاتا ہے، ان کو اطلاعِ غیب، اظہارِ غیب، اور انباءِ غیب سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ کہ علم الغیب سے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خود بخود جانتے ہیں، آپ کو اطلاع کی ضرورت نہیں ہوتی، اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بغیر اطلاعِ خداوندی کے خود بخود کچھ نہیں جانتے، بلکہ ان کو جو علم عطا ہوتا ہے وہ اطلاعِ خداوندی سے ہوتا ہے، لہٰذا اطلاع، اظہار اور انباءِ غیب اور چیز ہے، اور علمِ غیب اور چیز ہے۔

نیز واضح رہے کہ اس اطلاعِ غیب کی وجہ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "عالم الغیب" کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اطلاع علی الغیب سے کوئی شخص عالم الغیب نہیں بن سکتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان بیان فرمائی کہ: "وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ" یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی بات بتانے میں بخل نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جن علومِ غیبیہ کی اطلاع آتی ہے وہ لوگوں کو بتا دیتے ہیں، اس کے بتانے میں بخل نہیں کرتے، کیونکہ وہ مأمور من اللہ ہیں اور اَحکامِ الٰہی لوگوں تک پہنچانا ان کا فرضِ منصبی ہے۔ پس حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے ہوئے علوم کو چھپایا نہیں ہے، بلکہ پورا پورا لوگوں تک پہنچا دیا ہے، تو کیا اس اطلاعِ غیب کی وجہ سے سب لوگ

''عالم الغیب'' قرار پائیں گے؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو غیب کی اطلاع دی تو نبی ''عالم الغیب'' ٹھہرے، اور نبی نے ایسے غیب کی اطلاع اپنی اُمت کو کردی تو اُمت ''عالم الغیب'' ٹھہری؟ نہیں! نہیں! کیونکہ اطلاعِ غیب سے کسی کو ''عالم الغیب'' کہنا صحیح نہیں ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علومِ کثیرہ عطا ہوئے، بلکہ ساری مخلوق کے علوم سے بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ علوم عطا کیئے گئے ہیں۔

قصۂ مختصر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم ساری مخلوق کے علم سے زیادہ، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم سے کم ہیں، لیکن ان علوم کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عالم الغیب'' کہنا دُرست نہیں ہے، کیونکہ ''عالم الغیب'' ہونا اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس مختصر تمہید کو سامنے رکھ کر، اور مسئلۂ علمِ غیب کے متعلق ہدایاتِ قرآنیہ کو ذہن نشین کر کے حضرت سواد بن قارب رضی اللہ عنہ کے شعر کا مطلب سمجھنے کی کوشش کریں گے تو انشاٗ اللہ! صحیح نتائج تک پہنچنے میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔

حضرت سواد بن قاربؓ کے شعر کا صحیح مفہوم:

کتاب وسنت کی روشنی میں حضرت سواد بن قارب رضی اللہ عنہ کے قول: ''انک مأمون علٰی کل غائبٍ'' کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی! (ﷺ) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو علوم عطا کیئے ہیں، اور عطا وہی کیئے ہیں جو آپؐ کے شایانِ شان تھے، آپؐ ان سب علومِ غیبیہ عطائیہ پر مأمون ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ''کل غائب'' کا تعلق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ کے ''کل غائب'' کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جو علومِ غیبیہ عطا کیئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام پر مأمون ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے اپنے تمام علوم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردیئے ہیں اور اب اللہ اور اس کے نبی کے علوم برابر ہیں، اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف ذاتی اور عطائی کا ہے۔ حضرت سواد بن قارب رضی اللہ عنہ کے شعر کا یہ مطلب لینا کتاب و سنت کی تصریحات کے خلاف ہے، ایسا مطلب حضرت سوادؓ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا۔

لفظ ''کل'' کا مطلب:

لفظ ''کل'' سے علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری کو دھوکا نہ کھانا چاہئے، کیونکہ یہ کلمہ کبھی حصرِ حقیقی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی حصرِ اضافی اور حصرِ عرفی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ملکۂ بلقیس کے متعلق ارشادِ ربانی ہے: ''وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ.'' یعنی بلقیس کو ہر قسم کا سامان میسر ہے اور اس کے پاس ایک بڑا تخت ہے۔ اس آیت میں لفظ ''کل'' استعمال ہوا، لیکن یہ حقیقی معنی میں نہیں، بلکہ عرفی معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی ضرورت کی ہر چیز اس کو دی گئی تھی، اسی لئے تو مفتی نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے ''کنز الایمان'' کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ: ''جو بادشاہوں کے شایان ہوتا ہے''، پس ثابت ہوا کہ ''کل'' کا لفظ قرآن مجید میں بھی عرفی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ تورات کے متعلق فرماتے ہیں: ''تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ'' ظاہر ہے کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی تفصیل تورات میں موجود نہیں تھی، بلکہ ضرورت کی ہر وہ چیز جو اس وقت کے لوگوں کے لئے ضروری تھی اس میں مذکور تھی۔ لہٰذا اگر کہیں علامہ صاحب کو ''کل'' کا لفظ نظر آجائے تو اس پر خوش ہوکر ''کلّی غیب'' کی عمارت کھڑی نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ٹھنڈے دِل سے کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر اس کا معنی متعین کرنا چاہئے، کیونکہ قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علمِ غیب کلّی طور پر عطا نہیں کیا گیا، یہ دُرست ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

علومِ کثیرہ عطا کئے گئے، اگلوں اور پچھلوں سے زیادہ عطا کئے گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ عطا کیا گیا، ہم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کثیرہ اللہ تعالیٰ کے علم کے برابر نہیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علوم لامحدود ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم اللہ تعالیٰ کے علوم سے کم ہیں اور یقیناً کم ہیں، کیونکہ بعض علوم ایسے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا نہیں کئے گئے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اگر کل غیب کا لفظ استعمال ہوگا تو اس سے ''کل'' کا عرفی معنی مراد ہوگا، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت کے وہ تمام علوم عطا کئے گئے جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان تھے، نہ کہ ''کل'' کا حقیقی معنی مراد ہوگا، کیونکہ حقیقی معنی مراد لینے سے خالق اور مخلوق میں تساوی لازم آئے گی جو کہ شرک ہے، اور یہ معنی نصوصِ قطعیہ اور احادیثِ صحیحہ کے صرف خلاف ہی نہیں، بلکہ متصادم بھی ہے، لہٰذا ایسے مواقع پر ''کل'' کا عرفی معنی مراد ہوگا۔

ذاتی اور عطائی:

علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری اللہ تعالیٰ کے علم اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو برابر کہہ کر پھر ذاتی اور عطائی کا فرق کرتے ہیں تاکہ شرک کی زد سے بھی بچ سکیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہیں عطائی طور پر۔''

لیکن ہم ان لوگوں کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کی بقیہ صفات میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھ کر صرف ''ذاتی'' اور ''عطائی'' کے فرق باقی رکھنے کو گوارا کرلیں گے؟ مثلاً:

ا:... اللہ تعالیٰ معبود ہیں ذاتی طور پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم معبود ہیں

عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۲:... اللہ تعالیٰ مسجود ہیں ذاتی طور پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجود ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۳:... اللہ تعالیٰ رَبّ العالمین ہیں ذاتی طور پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم رَبّ العالمین ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۴:... اللہ تعالیٰ کی شان ہے "یُحْیِی وَیُمِیْت" ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان "یُحْیِی وَیُمِیْت" ہے عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۵:... اللہ تعالیٰ "حَیٌّ لَا یَمُوْت" ہیں ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "حَیٌّ لَا یَمُوْت" ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۶:... اللہ تعالیٰ ازلی و ابدی ہیں ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ازلی و ابدی ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۷:... اللہ تعالیٰ "خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" ہیں ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۸:... اللہ تعالیٰ "عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" ہیں ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۹:... اللہ تعالیٰ "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" ہیں ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

۱۰:... اللہ تعالیٰ "اَحَدًا صَمَدًا" ہیں ذاتی طور پر، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "اَحَدًا صَمَدًا" ہیں عطائی طور پر۔ (معاذ اللہ)

اگر علامہ صاحب ان صفاتِ مذکورہ میں "ذاتی" اور "عطائی" کے فرق کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو برابر سمجھتے ہوں تو وہ جانیں اور اُن کا کام، اور اگر برابر نہیں سمجھتے تو کیوں؟ پس مابہ الامتیاز بتائیں۔

قارئینِ کرام! مسئلۂ علمِ غیب کے متعلق بہت کچھ عرض کیا جاچکا ہے، لیکن مزید وضاحت کے لئے کتاب اللہ سے تین آیتیں ملاحظہ فرمائیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ''عالم الغیب'' صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہے، اور تین مزید ایسی آیات ملاحظہ فرمائیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''عالم الغیب'' نہیں ہیں۔

عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے:

آیاتِ کثیرہ میں سے صرف تین آیتیں آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علمِ غیب خاصۂ خداوندی ہے، اور اس صفت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

۱:... ''قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ، وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ.'' (النمل:۶۵)

ترجمہ:... ''(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے، اور ان کو یہ خبر نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کئے جاویں گے؟''

۲:... ''وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ.'' (الانعام:۵۹)

ترجمہ:... ''اور اللہ ہی کے پاس ہیں خزانے تمام مخفی اشیأ کے، ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔''

۳:... ''فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا، اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ.'' (یونس:۲۰)

ترجمہ:... ’’(اے پیغمبر!) سو آپ فرما دیجئے کہ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے، سو تم بھی منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔‘‘

فائدہ:... مذکورہ بالا تینوں آیتوں میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ ’’عالم الغیب‘‘ صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور علمِ غیب خاصۂ خداوندی ہے، اس صفت میں اس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں ہیں:

مندرجہ ذیل آیات اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہیں، لہٰذا ملاحظہ فرمائیں:

۱:... ’’قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ ......‘‘ (الانعام:۵۰)

ترجمہ:... ’’(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیبوں کو جانتا ہوں۔‘‘

۲:... ’’وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ، اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ.‘‘ (الاعراف:۱۸۸)

ترجمہ:... ’’اور اگر میں غیب کی باتوں کو جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کرلیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی، میں تو محض بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔‘‘

۳:... ’’وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ، نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ." (التوبۃ:۱۰۱)

ترجمہ:... "اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینے والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق کی حدِ کمال پر پہنچے ہوئے ہیں، آپ ان کو نہیں جانتے، ان کو ہم جانتے ہیں۔"

فائدہ:... مذکورہ بالا تینوں آیتوں سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "عالم الغیب" نہیں ہیں، بلکہ "عالم الغیب" صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے، اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے بے شمار احادیثِ صحیحہ موجود ہیں، لیکن ہم انہیں آیات پر اکتفا کرتے ہیں، البتہ چند سوالات علامہ صاحب کی خدمت میں پیش کرکے ان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

دعوتِ فکر:

علامہ صاحب! اگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "عالم الغیب" تھے اور سب کچھ پہلے سے جانتے تھے تو:

۱:... نزولِ وحی کا کیا فائدہ؟ جبرئیل کے آنے کا کیا مطلب؟ قرآن کیوں اُترا؟

۲:... بیر معونہ کی مشہور لڑائی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر قرآن کے قاری بھیجے جن کو کفار نے بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کردیا، اُن کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از وقت اس کا علم تھا؟ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شہادت کی خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت دکھ ہوا۔

۳:... "عالم الغیب" کی زبان مبارک سے "اِنْ اَدْرِیْ، لَا اَدْرِیْ، لَا اَعْلَمُ، اَنْتُمْ اَعْلَمُ، عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ" وغیرہ جملے بھی نکل سکتے ہیں؟

۴:...اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''عالم الغیب'' ہوتے تو جواب دینے میں وحی کے انتظار میں خاموش کیوں رہتے؟

اظہارِ تشکر:

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عالم الغیب سمجھنا شرکیہ نظریہ ہے، اس غلط نظریہ سے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پاک ہے، حضرت سواد بن قارب ؓ سمیت سارے صحابہ ؓ غیراللہ کو عالم الغیب نہیں سمجھتے تھے، ہاں! حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ عقیدہ اور نظریہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ وحی جو علوم عطا کے گئے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامون ہیں، الحمدللہ علی ذالک ثم الحمدللہ۔

۶:...اس نمبر میں علامہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''حضرت عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) صحابی اور دیگر صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کا ثبوت:
>
> حضرت عبداللہ بن سلام ؓ جب حضرت عمر ؓ کے جنازہ سے رہ گئے تو فرمایا: ''ان سبقتمونی بالصلوٰة علیه فلا تسبقونی بالدعاءِ لهٗ.'' اگر تم نے حضرت عمر ؓ کا جنازہ پہلے پڑھ لیا تو اُن کے لئے دُعا میں پہل نہ کرو، یعنی بعد جنازہ دُعا میں مجھے شامل ہونے دو۔ مبسوط سرخسی جلد:۲ صفحہ:۶۷۔ اب جو شخص نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کا منکر ہے اور اُسے گمراہی اور حرام و ناجائز قرار دیتا ہے، وہ صحابیٔ رسول عبداللہ بن سلام ؓ اور دیگر صحابہ ؓ کا منکر اور گستاخ ہے۔'' (نظریاتِ صحابہ ص:۲۱)

الجواب:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی اس بات سے نمازِ جنازہ کے بعد مخصوص طریقہ سے مانگی جانے والی دُعا قطعاً ثابت نہیں ہوتی۔ علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری نے نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کرنے کا ایک خاص طریقہ ایجاد کر رکھا ہے، اور وہ مخصوص طریقۂ دُعا یہ ہے کہ:

۱:... یہ دُعا سلام کے متصل بعد مانگی جائے۔

۲:... صفیں توڑ کر مانگی جائے۔

۳:... میّت کی چارپائی سامنے رکھ کر مانگی جائے۔

۴:... یہ دُعا ہاتھ اُٹھا کر مانگی جائے۔

۵:... اور یہ دُعا اجتماعی طریقہ سے مانگی جائے، وغیرہ وغیرہ۔

قارئینِ کرام! آپ کو یقین سے یہ بات عرض کی جارہی ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد اس خاص طریقہ سے جو دُعا مروّج ہوچکی ہے، اس کا ثبوت نہ تو کتاب اللہ سے ملتا ہے، اور نہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم سے ہے، اور نہ ہی اس خاص طریقہ سے کسی صحابی نے دُعا مانگی ہے، نہ کسی تابعی اور تبع تابعی نے بلکہ خیرالقرون میں نمازِ جنازہ کے بعد یہ مخصوص طریقہ دُعا کا قطعاً رواج نہ تھا۔ ائمۂ مجتہدین اور فقہاً متقدمین کے دور میں بھی یہ رسم جاری نہیں ہوئی، لیکن زمانہ خیرالقرون کے بہت بعد جب اہلِ بدعت نے اس کو ایجاد کیا اور لوگوں میں اس کو رواج دینے کی کوشش کی گئی تو اس دور کے فقہائے کرامؒ نے اس کو روکا، اور ناجائز، مکروہ اور بدعت قرار دیا، اور بتایا کہ یہ احداث فی الدین ہے، کیونکہ خیرالقرون میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ چنانچہ امام ابوبکر بن حامد الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"ان الدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ مکروہ."

(محیط، باب الجنائز)

ترجمہ:... ”نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مکروہ ہے۔“

اور علامہ فہامہ ابوحنیفہ ثانی ابنِ نجیم الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”ولا یدعو بعد التسلیم.“

(بحرالرائق ج:۲ ص:۱۸۳)

ترجمہ:... ”سلام پھیرنے کے بعد دُعا نہ کرے۔“

اور حضرت مُلّا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”لا یدعو بعد صلٰوۃ الجنازۃ.“

(مرقاۃ ج:۲ ص:۳۱۹)

ترجمہ:... ”نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہ کرے۔“

فقہ کی مشہور کتاب ”مجموعہ خوانی“ قلمی میں لکھا ہے:

”دُعا نخواند وفتویٰ بریں قول است۔“

(مجموعہ خوانی ص:۳۴۹)

ترجمہ:... ”نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہ کرے اور فتویٰ اسی پر ہے۔“

اور مفتی سعداللہ صاحب الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”خالی از کراہت نیست۔“ (فتاویٰ سعدیہ ص:۱۳۰)

ترجمہ:... ”نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کراہت سے خالی نہیں ہے۔“

علامہ برجندی حنفی رحمہ اللہ نے دُعا بعد نمازِ جنازہ کو مکروہ لکھا ہے۔

(حاشیہ برجندی علیٰ شرح وقایہ)

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”أیّ صلٰوۃ یکرہ الدعاء بعدھا؟ أقول: ھو

صلٰوۃ الجنازۃ." (نفع المفتی والسائل ص:۱۳۴)

ترجمہ:... "اگر پوچھا جائے کہ وہ کون سی نماز ہے جس کے بعد دُعا مکروہ ہے تو میں جواب دوں گا کہ: یہ نمازِ جنازہ ہے، کیونکہ اس کے بعد دُعا مکروہ ہے۔"

شیخ الاسلام علامہ ابوبکر بن علی الحداد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ولا یدعو بعدھا بشیٔ."

(الجوہرۃ النیرہ ج:۱ ص:۱۳۰)

ترجمہ:... "سلام کے بعد کسی قسم کی دُعا نہ کرے۔"

نواب قطب الدین صاحب رحمہ اللہ شارحِ مشکوٰۃ لکھتے ہیں:

"نیز علماً یہ مسئلہ لکھتے ہیں کہ نمازِ جنازہ کے بعد میّت کے لئے دُعا نہ کی جائے (جیسا کہ دوسری نمازوں میں سلام پھیرنے کے بعد دُعا مانگی جاتی ہے) کیونکہ اس سے نمازِ جنازہ میں اضافہ کا اشتباہ ہوتا ہے۔"

(مظاہرِ حق ج:۲ ص:۱۲۵، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

"مالا بدمنہ" کے حاشیہ پر لکھا ہے:

"وبعد تکبیر چہارم سلام گویند وبعد آں ہیچ دُعا نہ خوانند۔"

ترجمہ:... "چوتھی تکبیر کے بعد سلام کریں اور اس کے بعد کوئی دُعا نہ کریں۔"

یاد رہے کہ "مالا بدمنہ" کے حواشی مفتی سعداللہ صاحبؒ کے لکھے ہوئے ہیں، اور علامہ حافظ سیّد محمد عبداللہ صاحب اور فاضل اوحد مفتی عنایت اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ان پر نظرِ ثانی فرمائی ہے۔ المدخل لابن امیر الحاج میں بھی اس دُعا سے منع کیا گیا

ہے، تلک عشرۃ کاملۃ!

قارئینِ کرام! دس کتابوں کے حوالے آپ کے سامنے ہیں، جن میں نمازِ جنازہ کے بعد والی دُعا کو مکروہ اور ناجائز کہا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے، اور مطلق دُعا سے روکا گیا ہے، اس میں اُٹھنے اور بیٹھنے کی کوئی قید موجود نہیں ہے، لہٰذا اہلِ بدعت کی یہ تأویل کہ ''کھڑے ہوکر دُعا مانگنے سے منع کیا گیا ہے، نہ کہ بیٹھ کر مانگنے سے'' باطل ہے، لہٰذا آپ مذکورہ بالا حوالہ جات کو غور سے پڑھیں، یہاں مطلقاً دُعا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ چند مزید حوالہ جات بھی ملاحظہ فرمائیں:

شمس الائمہ امام حلوانی الحنفی رحمہ اللہ اور بخارا کے مفتی قاضی شیخ الاسلام علامہ سغدی الحنفی فرماتے ہیں:

''لا یقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ.''

(قنیہ ج:۱ ص:۵۶)

ترجمہ:... ''نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کے لئے کوئی شخص نہ ٹھہرے۔''

امام طاہر بن احمد البخاری الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''لا یقوم بالدعاء فی قراءۃ القراٰن لاجل المیّت بعد صلوٰۃ الجنازۃ وقبلها.''

(خلاصۃ الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۲۵)

ترجمہ:... ''نمازِ جنازہ کے بعد اور اسی طرح اس سے قبل میّت کے لئے قرآن پڑھ کر دُعا نہ کی جائے۔''

علامہ سراج الدین اودی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اذا فرغ من الصلوٰۃ لا یقوم بالدعاء.''

(فتاویٰ سراجیہ ص:۲۳)

ترجمہ:... ’’جب نمازِ جنازہ سے فارغ ہوجائے تو دُعا کے لئے نہ ٹھہرے۔‘‘

امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردی الحنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’لا یقوم بالدعاء بعد صلٰوۃ الجنازۃ لانہ دعا مرۃً.‘‘ (فتاویٰ بزازیہ ج:۱ ص:۲۸۳)

ترجمہ:... ’’نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کے لئے نہ ٹھہرے، کیونکہ اس نے ایک دفعہ (جنازہ میں) دُعا کرلی ہے۔‘‘

امام شمس الدین محمد خراسانی کوہستانی الحنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’ولا یقوم داعیًا لہ.‘‘ (جامع الرموز ج:۱ ص:۱۲۵)

ترجمہ:... ’’نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کے لئے نہ ٹھہرے۔‘‘

ناظرین حضرات! مندرجہ بالا فقہائے کرامؒ اور مفتیانِ عظام کی مراد یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کرنا منع ہے، کیونکہ ایک دفعہ نمازِ جنازہ کے اندر دُعا کی جاچکی ہے، اور اب دوسری دفعہ دُعا کرنا جنازہ میں اضافہ کے مشابہ ہے، لہٰذا جنازہ کے بعد دُعا نہیں مانگنی چاہئے۔ مذکورہ بالا عبارات سے یہ مراد لینا کہ کھڑے ہوکر دُعا نہ کی جائے بلکہ بیٹھ کر کی جائے، **تأویل القول بما لا یرضٰی بہ القائل** کا مصداق ہے، اگر فقہاؒ کی مراد یہی ہوتی تو وہ آگے تصریح کرتے: **’’لا یقوم بالدعاء بل یجلس‘‘** یعنی کھڑے ہوکر دُعا نہ کرے، بلکہ بیٹھ کر کرے۔ حالانکہ یہ تصریح کسی فقیہ نے نہیں کی، لہٰذا اہلِ بدعت کی یہ تأویل باطل اور مردود ہے۔ پس جس طرح سابقہ دس حوالوں میں صاف طور پر مطلقاً دُعا سے منع کیا گیا ہے، ان حوالہ جات سے بھی یہی مراد ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد کوئی آدمی مطلقاً دُعا کے لئے نہ ٹھہرے۔

فقہائے کرامؒ کے طرزِ بیان سے استدلال:

فقہائے کرامؒ کی عادت ہے کہ کتاب الجنائز اور باب الجنائز میں نمازِ جنازہ کا مسنون طریقہ بیان فرماتے ہیں، ابتدأ سے لے کر سلام تک جو کچھ ثابت من السنہ ہے، تحریر فرماتے ہیں، سلام پھیرنے کے بعد یہ حضرات میّت اُٹھانے اور قبرستان لے جانے اور دفنانے کے مسائل بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس طرزِ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلام کے بعد اور چارپائی اُٹھانے سے پہلے کوئی مسنون عمل باقی نہیں رہا جس کو چارپائی رکھ کر پورا کیا جائے، اگر اس درمیانی وقت میں کوئی عمل دُعا وغیرہ کا باقی ہوتا تو اس کو فقہائے کرامؒ ضرور بیان فرماتے، حتیٰ کہ ''بہارِ شریعت'' کے فاضل مؤلف نے سلام کے بعد مروّجہ دُعا کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ دفن وغیرہ کے دوسرے مسائل لکھنا شروع کر دیئے، پس معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دُعا وغیرہ فقہائے احناف کے نزدیک غیر ثابت، بلکہ محدث فی الدین ہیں۔

علامہ صاحب حنفی ہیں یا غیر مقلد؟

مقلد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے امام کی تحقیقات پر پورا پورا اعتماد کرے اور اپنے امام کی فقہ میں جو قول مفتیٰ بہ اور راجح پائے، اس پر عمل کرے اور اس کو کتاب و سنت سے مستنبط سمجھے، اگر مقلد اہلِ علم اور صاحبِ بصیرت ہے تو اپنے امام کی فقہ کے دلائل کتاب و سنت یا اجماع و قیاس سے تلاش کرے، بہرحال ایک مقلد کا وظیفہ تقلید کرنا ہے، اپنے امام کے مفتیٰ بہ اور راجح اقوال کو چھوڑنا ایک مقلد کے لئے جائز نہیں ہے، ہاں! غیر مقلد جو کہ تقلید کا قائل ہی نہیں ہے، بلکہ تقلید کو گناہ سمجھتا ہے اور فقہ کا دُشمن ہے، اپنی خواہش اور مرضی سے مسائل گھڑتا ہے، پھر انہی گھڑے ہوئے مسائل اور عقائد کے دلائل قرآن و حدیث سے ڈھونڈنے کی سعی مذموم کرتا ہے، وہ اس بحث سے خارج ہے، کیونکہ مسائل خود اختراع کرنا، پھر اس کے دلائل ڈھونڈنا غیر مقلد کا

کام ہے، مقلد کا یہ کام نہیں، بلکہ مقلدین کے نزدیک یہ طریقہ ازخود غلط ہے، اور غلط طریقہ سے آدمی کبھی بھی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

اور ...ماشآاللہ... علامہ صاحب مقلد ہیں اور اپنے آپ کو امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا پیروکار سمجھتے ہیں، تو ان کو چاہئے کہ نمازِ جنازہ کے بعد والی دُعا کو سب سے پہلے فقہ حنفی اور امام ابوحنیفہؒ سے ثابت کریں، پھر کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ سے اس کے دلائل پیش کریں، یہ ہے صحیح طریقہ جس کو چھوڑ کر علامہ صاحب براہِ راست قرآن وحدیث اور اقوالِ صحابہؓ سے دلائل پیش کرنا شروع کردیتے ہیں، حالانکہ یہ غیرمقلدین کا غلط طریقہ ہے جس کو علامہ صاحب نے اپنا رکھا ہے۔

علامہ صاحب فقہ حنفی سے دلائل کیوں بیان نہیں کرتے؟

علامہ صاحب باوجود حنفی ہونے کے فقہ حنفی سے دلائل اس لئے بیان نہیں کرتے کہ دُعا بعد الجنازہ کا اکثر کتابوں میں تذکرہ نہیں ہے، اور جن کتابوں میں اس دُعا کا ذکر کیا گیا ہے، تو اس طرح سے کہ یہ دُعا مکروہ ہے، ناجائز ہے، منع ہے، اور اس دُعا کے لئے کسی کو نہیں ٹھہرنا چاہئے، چونکہ یہ دُعا علامہ صاحب کو فقہ حنفی سے نہ مل سکی، لہٰذا غیرمقلدین کی طرح براہِ راست کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ سے دلائل پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، سچ کہتے ہیں: ''مجبوری کا نام شکریہ!''

کیا علامہ صاحب کا علم وتقویٰ فقہائے کرامؒ سے بڑھا ہوا ہے؟

آپ نے فقہ حنفیہ کی تقریباً سولہ کتابوں سے حوالہ جات بمع عبارات دیکھے ہیں، سب میں دُعا بعد الجنازہ سے منع کیا گیا ہے، لیکن علامہ صاحب اس دُعا کو ''نظریۂ صحابہ کرام'' بتلاتے ہیں، علامہ صاحب! کیا کتاب وسنت اور اقوال ونظریاتِ صحابہ کو آپ زیادہ جانتے ہیں یا فقہائے کرامؒ؟ کیا آپ کے پیش کردہ دلائل ان

حضرات کے سامنے نہیں تھے؟ کیا وہ لوگ نظریاتِ صحابہؓ سے ناواقف تھے؟ اتنے دلائل اور نظریات کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس دُعا سے کیوں منع کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ صاحب کے پیش کردہ نظریات اور دلائل اس قابل نہ تھے کہ ان سے دُعا بعد الجنازہ ثابت کی جائے، اسی لئے فقہاًکرام نے ان دلائل اور نظریات کو رَدّی کی ٹوکری میں ڈال کر اس دُعا سے منع کردیا، کیونکہ ان کے نزدیک کتاب وسنت اور نظریاتِ صحابہؓ سے یہ دُعا ثابت نہیں ہے، یوں کہہ کر گلوخلاصی کرنا کہ فقہائے کرامؒ کو ان نظریات اور دلائل کا علم نہیں ہوسکا اور علامہ صاحب کو ان کا علم ہوگیا ہے، یہ غیرمقلدین کا وطیرہ ہے، اور کارِ خردمنداں نیست کا مصداق ہے، غیرمقلدین کا یہ کہنا کہ فقہائے کرامؒ کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ کونہیں جانتے تھے اور ہم جانتے ہیں، یہ ان کی فقہ دُشمنی اور سوئے فہم وقلتِ تدبر کا نتیجہ ہے، کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ھم أعلم بمعانی الحدیث'' (ترمذی شریف ج:۱ ص:۱۱۸) یعنی حدیث کے معانی اور مراد کو سب سے زیادہ جاننے والے فقہائے کرامؒ ہیں، امام ترمذیؒ نے سچ فرمایا اور یہی حقیقت ہے، اور غیرمقلدین غلط کہتے ہیں اور ان کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔

اُصولِ فقہائے کرامؒ کی خلاف ورزی:

علامہ صاحب اور ان کے ہم مذہب لوگ جب غیرمقلد بن کر اپنے خانہ ساز مسائل وعقائد کو بزعمِ خویش قرآن وحدیث اور اقوالِ صحابہ کرامؓ سے ثابت کرنے کے لئے سعیٔ ناتمام کرتے ہیں، تو فقہاًعظام کے مسلّمہ اُصولوں کو پسِ پشت ڈال کر ان کی پروا بھی نہیں کرتے، اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

مثالِ اَوّل:

نمازِ جنازہ کے بعد مانگی جانے والی دُعا ایک خاص موقع ومحل کی دُعا ہے، جس کو ثابت کرنے کے لئے دلیلِ خاص کی ضرورت ہے، لیکن علامہ صاحب اور اُن

کے ہم خیال لوگ اس کو عام دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً: "اُجِیبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" پڑھ لیتے ہیں، یا "قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" پڑھ لیتے ہیں، یا "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" پڑھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ دلیلیں عام ہیں اور دعویٰ خاص ہے، اور یہ فقہاً کا مسلّمہ اُصول ہے کہ عام دلیلوں سے خاص دعویٰ ہرگز ثابت نہیں ہوتا، لیکن اہلِ بدعت اُصولوں کی کوئی پروانہیں کرتے اور اپنے من گھڑت مسائل کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ذکر، تلاوت، دُعا، دُرود، کلمہ وغیرہ بیسیوں عبادات ایسی ہیں جن کے بے شمار فضائل قرآن و حدیث میں وارِد ہیں، لیکن اگر کوئی شخص انہیں عباداتِ مطلقہ کو کسی خاص وقت یا کسی خاص موقع ومحل کے لئے اپنی طرف سے بلا دلیلِ شرعی مقرر کرتا ہے اور اس پر بطورِ دلیل کے عام آیات اور روایات پیش کرتا ہے تو یہ اس کی بے اُصولی اور اُصول کی خلاف ورزی ہوگی، مثلاً: ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ نمازِ جنازہ میں قراءۃِ قرآن اور تلاوۃِ کلام اللہ ضروری ہے، لیکن اس کو ثابت کرنے کے لئے قراءۃِ قرآن اور تلاوۃِ قرآن کے عام فضائل جو قرآن وحدیث میں وارِد ہیں، پیش کرتا ہے، تو ان عام فضائلِ تلاوۃ سے اس خاص موقع کی تلاوۃ ہرگز ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ دعویٰ خاص ہے اور دلیل عام ہے، پس جس طرح عام فضائلِ تلاوۃ کے ذریعہ نمازِ جنازہ میں خاص موقع کی تلاوت کو ثابت کرنا بے اُصولی اور غیرمقلدیت ہے، اسی طرح دُعا کے عام فضائل بیان کرکے نمازِ جنازہ کے بعد والی خاص موقع کی دُعا ثابت کرنا بے اُصولی اور غیرمقلدیت ہے، بہرحال عام فضائلِ اعمال کے ذریعہ کسی خاص موقع ومحل کے عمل کو ثابت کرنا اُصول کے خلاف ہے۔

دوسری مثال:

فقہائے کرامؒ کا اُصول ہے کہ اپنی طرف سے بلا دلیلِ شرعی عباداتِ مطلقہ کی کسی خاص زمان ومکان کے ساتھ تخصیص کرنا صحیح نہیں ہے، مثلاً: مصافحہ کرنا سنت

ہے، لیکن نمازوں کے بعد مصافحہ کی تخصیص صحیح نہیں، اسی طرح روزہ عبادت ہے، لیکن جمعہ کے دن کے ساتھ اس کی تخصیص دُرست نہیں، اسی طرح ایصالِ ثواب ثابت من السنۃ ہے، لیکن ایامِ مخصوصہ کے ساتھ اس کی تخصیص غلط ہے، بعینہٖ اسی طرح نمازِ جنازہ کے متصل بعد دُعا کی تخصیص خانہ زاد ہے، جس پر کوئی دلیلِ شرعی موجود نہیں ہے، پس اس خاص وقت کی دُعا کو ثابت کرنا بے اُصولی اور اُصول کی خلاف ورزی ہے۔

تیسری مثال:

فقہائے کرامؒ کا اُصول ہے کہ عباداتِ مطلقہ کی اپنی طرف سے ایک خاص قسم کی ہیئت اور شکل وصورت ایجاد کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ صلوٰۃ الرغائب اور نوافل کا باجماعت اہتمام۔ نماز کے بے شمار فضائل موجود ہیں، لیکن بلا دلیلِ شرعی اپنی طرف سے اس کی کوئی مخصوص ہیئت اور شکل وصورت ایجاد کرنا غلط ہے، اسی لئے فقہائے کرامؒ نے صلوٰۃ الرغائب اور نوافل کے باجماعت اہتمام سے منع کردیا ہے۔ اور نمازِ جنازہ کے بعد مانگی جانے والی دُعا کی بھی ایک مخصوص شکل وصورت ہے اور خاص ہیئت ہے، جس کو بلا دلیلِ شرعی ازخود بنایا گیا ہے، اس دُعا کے باقاعدہ ارکان واجزا ہیں، جن کو ملاکر اس کی خاص صورت بنائی گئی ہے، مثلاً: یہ دُعا نمازِ جنازہ کے متصل بعد ہونی چاہئے، صفیں توڑ دینی چاہئیں، میّت کی چارپائی بھی سامنے موجود ہونی چاہئے، ہاتھ اُٹھاکر باقاعدہ اجتماعی دُعا ہونی چاہئے، یقین جانئے یہ سارے ارکان و اجزا اہلِ بدعت کے خانہ ساز ہیں، لیکن اہلِ بدعت اس دُعا کے ایک ایک رُکن کو اتنا اہم اور ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کو فرائضِ خداوندی سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں، ان خودساختہ ارکان میں سے اگر کوئی شخص کسی ایک رُکن کو چھوڑ دے تو جھگڑتے ہیں، بلکہ لڑتے ہیں اور مرمٹنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، کسی نے چارپائی اُٹھانے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ لڑائی، اور اگر کسی نے دُعا کے لئے ہاتھ نہیں اُٹھائے تو اس کے ساتھ

جھگڑا، اور کوئی ان کے اس اجتماع میں شامل نہیں ہوا تو اس پر ناراض، یہ لوگ نماز، روزہ اور عشر و زکوٰۃ چھوڑنے والے کے ساتھ اتنا نہیں لڑتے جتنا دُعا بعد الجنازہ کی شکلِ مخصوصہ چھوڑنے والے کے ساتھ لڑتے ہیں، حالانکہ دُعا کی یہ شکل وصورت بنانا خود بے اُصولی اور مسلّمہ اُصولوں کی خلاف ورزی ہے۔

فقہائے کرامؒ کے یہ مسلّمہ اُصول امام شاطبی رحمہ اللہ کی ''الاعتصام''، اور شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ''، ''بحر الرائق'' اور ''فتاویٰ شامی'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

قارئینِ کرام! آپ کو معلوم ہوگیا کہ خیر القرون میں دُعا بعد الجنازہ کا رواج نہیں تھا، اسی لئے فقہائے کرامؒ اس سے منع کرتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں اور مکروہ لکھتے ہیں، اور اہلِ بدعت بزعمِ خویش جن دلائل سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان سے تو مسلّمہ اُصول ٹوٹتے ہیں، اگر بالفرض و المحال ان سب باتوں سے چشم پوشی کرلی جائے اور علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری کے دلائل سے جواز و اِباحت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو پھر بھی دُعا بعد الجنازہ مکروہ اور ممنوع ٹھہرتی ہے، کیونکہ عوام الناس اس کو ضروری سمجھتے ہیں، فرائض سے بھی اس کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور تارک کو ملامت کرتے ہیں، بلکہ لڑتے اور جھگڑتے ہیں، حالانکہ فقہائے کرامؒ کا مسلّمہ اُصول ہے کہ ایک چیز فی نفسہٖ اگر چہ مباح اور مستحب ہو اور لوگ اس کو ضروری سمجھنے لگیں تو اس کو ترک کردینا چاہئے، کیونکہ ایسے مباح و مستحب کو کرنا مکروہ ہے، دیکھو فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص:۱۳۶، شامی ج:۱ ص:۵۷۷۔

فقہاؒ کا ایک اُصول:

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ ردّ المحتار میں تحریر فرماتے ہیں:

''اذا تردّد الحکم بین سنۃٍ وبدعۃ، کان ترک

السنة راجحًا علٰی فعل البدعة.‘‘ (ردّالمحتار ج:۱ ص:۴۷۵)

ترجمہ:... ’’جب کوئی حکم سنت اور بدعت کے درمیان دائر ہو، تو سنت کا ترک کرنا فعلِ بدعت پر مقدم ہوگا۔‘‘

دیکھ لیا آپ نے! علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اگر کسی حکم کے متعلق شبہ پڑجائے کہ یہ سنت ہے یا بدعت؟ تو ایسے کام کو چھوڑ دینا چاہئے۔ علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ جس حکم کا سنت ہونا مشکوک ہوجائے تو اس کو بھی ترک کردو، اور دُعا بعد الجنازہ کا تو خود ثابت اور مباح ہونا بھی مشکوک ہے، لہٰذا اس کو ہر حال میں ترک کردینا ضروری ہے، اور ایسے اَحکام پر لوگوں کو عمل کرنے کی دعوت دینا پرلے درجے کی بے اُصولی ہے۔

نمازِ جنازہ کے بعد کون سی دُعا پڑھی جائے؟

علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری دُعا بعد الجنازہ کو ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، کبھی تو آیات اور احادیث سے من مانا مطلب کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور کبھی فقہاً کے اقوال کی بے جا تأویل کرتے ہیں، اور کبھی مجبور ہوکر مسلَّمہ اُصول توڑ ڈالتے ہیں، بہرحال اپنی ایجاد کردہ دُعا کو پورا زور لگاکر ’’مستند‘‘ کرنے کی سعی کرتے ہیں، لیکن لاحاصل! کیونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جہاں دُعا مانگی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کے الفاظ کو محفوظ کیا ہے، اور محدثین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے الفاظ اپنی کتابوں میں جمع کردیئے ہیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ پنج گانہ کے بعد جو دُعا مانگی ہے، اُس کے الفاظ حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر پر جاتے ہوئے اور سفر سے واپس آتے ہوئے جو دُعا پڑھی ہے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں داخل ہوتے وقت

اور مسجد سے نکلتے وقت جو دُعا پڑھی ہے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، حتیٰ کہ بیت الخلا کی طرف جاتے وقت اور اس سے باہر نکلتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دُعا پڑھی ہے وہ بھی کتبِ حدیث میں موجود ہے، الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں دُعا پڑھی ہے وہ بالفاظہٖ موجود ہے، لیکن علامہ صاحب بتائیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ کے بعد جو دُعا مانگی، اس کے الفاظ کیا ہیں؟ اگر علامہ صاحب ہمیں ذخیرۂ احادیث سے دُعا کے الفاظ ثابت کردیں تو ہم ... انشأ اللہ ... حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والی دُعا بعد الجنازہ ضرور پڑھا کریں گے، اور اگر علامہ صاحب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ دعائیہ نہیں بتاسکتے ... اور یقیناً نہیں بتاسکتے... تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی دُعا نہیں فرمائی، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دُعا فرمائیں اور صحابہ کرامؓ اس دُعا کے الفاظ کو بھلادیں، پس ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ کے بعد کوئی دُعا نہیں فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کیوں نہیں فرمائی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ من وجہٍ نماز، اور من وجہٍ دُعا ہے، جیسا کہ علامہ ابنِ نجیم رحمہ اللہ "بحرالرائق شرح کنز الدقائق" جلد:۲ صفحہ:۱۸۶ میں لکھا ہے: "لأنها صلٰوة من وجه." یعنی نمازِ جنازہ من وجہٍ نماز ہے، اور صفحہ:۱۸۷ پر لکھا ہے: "لأن صلٰوة الجنازة ليست بصلٰوة حقيقية" یعنی نمازِ جنازہ حقیقی نماز نہیں ہے (من وجہٍ نماز ہے)۔ اور جلد:۱ صفحہ:۲۵۱ پر لکھا ہے: "بأنهما ليسا بصلٰوة مطلقة" یعنی نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت نمازِ مطلقہ نہیں ہیں، یعنی من وجہٍ نماز ہیں۔ اور علامہ شامی رحمہ اللہ جلد:۱ صفحہ:۶۵۳ پر لکھتے ہیں: "ولا شک ان الصلٰوة على الميّت

دُعـاء و ذکـر" یعنی نمازِ جنازہ دُعا و ذکر ہے۔ پس علامہ ابنِ نجیم اور علامہ شامی رحمہما اللہ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ جنازہ صلوٰۃِ مطلقہ اور صلوٰۃِ حقیقیہ نہیں ہے، بلکہ من وجہٍ نماز اور من وجہٍ دُعا ہے، اسی لئے اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا نہیں فرمائی، کیونکہ ایک حیثیت سے نمازِ جنازہ خود دُعا ہے۔

اور یہی بات "ہدایہ" جلد:۱ صفحہ:۱۸۱ پر بھی لکھی ہوئی ہے: "**لأنهـا دُعـاء .... لأنها صلوٰة من وجه**" یعنی نمازِ جنازہ من وجہٍ دُعا ہے اور من وجہٍ نماز۔ بخلاف نمازِ پنج گانہ کے کہ وہ حقیقتاً صلوٰۃِ مطلقہ ہیں، اسی لئے ان کے بعد دُعا مانگنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، لیکن نمازِ جنازہ چونکہ صلوٰۃِ مطلقہ نہیں ہے، بلکہ من وجہٍ صلوٰۃ اور من وجہٍ دُعا ہے، اس لئے اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر دُعا نہیں مانگی، لہٰذا اس موقع پر دُعا نہ مانگنا سنت ہے، کیونکہ جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اس کا کرنا سنت ہے، اور جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، اس کا نہ کرنا سنت ہے، چنانچہ حضرت مُلاّ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "**والمتابعة كما تكون في الفعل يكون في الترك ايضًا، فمن واظب علٰى فعل لم يفعلهُ الشارع فهو متبدعٍ.**" (مرقاۃ ج:۱ ص:۴۱)
>
> ترجمہ:... "متابعت جیسے فعل میں ہوتی ہے، اسی طرح ترک میں بھی متابعت ہوتی ہے، سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے۔"

پس ثابت ہوا کہ فعل اور ترکِ فعل دونوں میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور تابعداری کرنی ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کام کیا، اس کا کرنا سنت ہے، اور جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، اس کا نہ کرنا سنت ہے۔

ایک عامیانہ شبہ اور اس کا جواب:

اہلِ بدعت کے عوام و خواص عموماً یہ کہتے ہیں کہ: ''اگرچہ اس دُعا کا ثبوت نہیں ہے، لیکن اس دُعا میں کیا حرج ہے؟'' اور مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ یہ دُعا مانگی نہیں، لیکن روکا بھی نہیں!''

جواباً عرض ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہیں مانگی، اور نہ ہی یہ دُعا اصحابِ رسولؐ سے ثابت ہے، اور نہ ہی خیرالقرون میں اس کا رواج تھا، پورے تین زمانوں میں اس پر عمل نہیں کیا گیا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کو تو نیکیوں کا بڑا شوق تھا، اگر اس موقع کی دُعا میں کوئی حرج نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ ضرور اس موقع پر دُعا مانگتے، ان حضرات کا اس پر عمل نہ کرنا حرج کی واضح دلیل ہے۔

دیکھو! عیدین کی نماز تو پڑھی جاتی ہے، لیکن بغیر اذان و اقامت کے، اگر کوئی شخص کہے کہ: ''عیدین کی نماز کے لئے اذان و اقامت کیوں نہیں دی جاتی، اگر دی جائے تو کیا حرج ہے؟'' تو جواب یہ ہوگا کہ خیرالقرون میں یہ عمل جاری نہیں ہوا، اور خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ عمل جاری نہیں فرمایا، آخر اس میں کوئی حرج ہے جس کی وجہ سے ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا، اور ایک حرج یہ ہے کہ یہ دین میں ایک قسم کا اضافہ ہے، جس کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے...!

دیکھئے! نمازِ جنازہ کے لئے نہ اذان کہی جاتی ہے، نہ اقامت، اور نمازِ جنازہ میں نہ قراءۃِ قرآن کی جاتی ہے، نہ رکوع و سجود اور نہ التحیات، اگر یہ سب چیزیں نمازِ جنازہ میں شامل کردی جائیں تو کیا حرج ہے؟ پس جو حرج ان چیزوں کے شامل کرنے میں ہے، وہی حرج دُعا میں ہے، اگر دُعا مانگنے میں کوئی حرج نہیں ہے تو ان سب چیزوں کی ملاوٹ بھی کردیں، پھر ان میں بھی کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔

باقی رہا یہ سوال کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا، تو گزارش ہے کہ مندرجہ بالا چیزوں سے بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا، اور نہ کوئی شخص ان کا منع دکھلاسکتا ہے، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی اذان و اقامت سے منع فرمایا، اور نہ رکوع وسجود سے منع فرمایا، اور نہ ہی قراءۃ اور التحیات سے منع فرمایا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عیدین کی اذان و اقامت سے بھی منع نہیں فرمایا، پس اگر منع نہیں فرمایا تو پھر ہم اس پر عمل شروع کردیں؟ نہیں! نہیں! یہ تو دین نہیں ہوگا بلکہ اتباعِ ہویٰ ہوگا، اتباعِ رسول یہی ہے کہ دین کا جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، وہ کرو، اور جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، وہ نہ کرو، یہ ہے اتباعِ رسول! اللہ تعالیٰ کا دین کامل و مکمل ہے، اس میں ترمیم و اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جو شخص نئی نئی عبادتیں ایجاد کرکے دین میں ملاوٹ کرنا چاہتا ہے وہ مبتدع ہے، اور نئی ایجاد کردہ عبادتیں مردود ہیں، اور احداث فی الدین حرام ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من احدث فی امرنا ھٰذا ما لیس منہ فھو رد."

(بخاری ج:۱ ص:۳۷۱، مسلم ج:۲ ص:۷۷، ابوداؤد ج:۲ ص:۲۷۹، ابن ماجہ ص:۳، مسند احمد ج:۶ ص:۳۷، جامع صغیر ج:۴ ص:۱۵۹)

ترجمہ:... "جس شخص نے ہمارے اس معاملہ (دین) میں کوئی نئی بات نکالی، تو وہ مردود ہوگی۔"

یہ حدیث اُصولِ اسلام میں سے ہے، اس میں واضح طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ جو چیز دینِ اسلام میں شامل نہیں، اس کو اگر کوئی شخص زبردستی دین میں شامل کرتا ہے، وہ چیز مردود ہے، اور احداث فی الدین حرام ہے، اور حدیث شریف میں جو "فی امرنا ھٰذا" کے الفاظ وارِد ہوئے ہیں، اس سے مراد دینِ اسلام ہے، یعنی دین میں نئی چیزیں ایجاد کرنا حرام اور ممنوع ہے، یہ قید اس لئے لگائی گئی تاکہ کوئی شخص

چائے کی پیالی کو بدعت نہ کہہ دے، سائیکل وغیرہ کی سواری کو بدعت میں شمار نہ کرے، اور گنے کے رس یا رُوح افزا کے شربت کو مردود نہ ٹھہرائے، کیونکہ ان چیزوں کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال نہیں فرمایا، اور یہ چیزیں خیرالقرون میں نہیں تھیں، لیکن یہ چیزیں اور اس قسم کی نئی ایجادیں بدعت کی حد میں نہیں آتیں، کیونکہ یہ اُمورِ دنیا سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں، اور بدعت احداث فی الدین کو کہتے ہیں، نہ کہ احداث فی اُمورِ الدنیا کو، یہی وجہ ہے کہ چائے پینے کو اور سائیکل کی سواری کو اور شربت وغیرہ پینے کو کوئی شخص دین نہیں سمجھتا، اور نہ ان چیزوں کے استعمال کو ثواب سمجھتا ہے، اگر کوئی شخص چائے یا شربت نہ پیئے یا سائیکل وغیرہ کی سواری نہ کرے تو اس کو ملامت نہیں کی جاتی اور نہ ہی اس سے کوئی اختلاف کیا جاتا ہے، اور نہ ہی اس پر کوئی فتویٰ بازی ہوتی ہے، بخلاف دُعا بعد الجنازہ کے کہ اس کو دین وعبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے اور ترک کرنے والے کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کیا جاتا ہے، اور اس پر فتویٰ بھی لگایا جاتا ہے، لہٰذا چائے کی پیالی پینے اور سائیکل کی سواری سے دُعا بعد الجنازہ ثابت نہیں ہوسکے گی، کیونکہ دُعا کو عبادت سمجھ کر مانگا جاتا ہے، اور سائیکل، چائے اور شربت کو عبادت اور ثواب سمجھ کر استعمال نہیں کیا جاتا، لہٰذا یہ قیاس، قیاس مع الفارق ہوگا، یعنی ایسا قیاس باطل اور مردود ہوگا، کیونکہ یہ قیاس خلافِ اُصول ہے، اسی لئے "فی امرنا ھٰذا" کی قید لگا کر واضح کیا گیا ہے کہ دین میں نئی چیزیں ایجاد کرنا حرام اور ممنوع ہے، اس حدیث کا تعلق دنیاوی اُمور سے نہیں ہے، اور یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ حدیث شریف میں "احداث فی الدِّین" سے منع کیا گیا ہے، نہ کہ "احداث لِلدِّین" سے، جیسا کہ مدارسِ دینیہ میں پڑھایا جانے والا نصابِ تعلیم، یہ "احداث فی الدِّین" نہیں بلکہ "احداث لِلدِّین" ہے، کیونکہ یہ نصابِ تعلیم مقصود نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود تعلیمِ قرآن وحدیث ہے، اور یہ نصاب اصل مقصد تک پہنچنے کا آلہ اور ذریعہ ہے، لہٰذا اس

پر بدعت کا اطلاق صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ "احداث لِلدِّین" ہے، اور بدعت "احداث فی الدِّین" کو کہتے ہیں۔

آمدم برسر مطلب:

قارئینِ کرام! دُعا بعد الجنازہ کے موضوع پر گفتگو ذرا طویل ہوگئی، لیکن انشاءَ اللہ فائدے سے خالی نہیں ہوگی، اب ہم علامہ صاحب کے استدلال کا جواب عرض کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ صاحب کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جنازہ سے رہ گئے تو فرمایا: "ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاءِ لہٗ" اگر تم نے حضرت عمرؓ کا جنازہ پہلے پڑھ لیا تو اُن کے لئے دُعا میں پہل نہ کرو، یعنی بعد جنازہ دُعا میں مجھے شامل ہونے دو۔ انتہیٰ
(نظریاتِ صحابہ ص:۲۱)

جواباً عرض ہے کہ علامہ صاحب خواہ مخواہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے قول سے اپنا من مانا مطلب نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں، ورنہ درحقیقت حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے قول کا علامہ صاحب کی دُعا مخصوصہ سے کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ ان کے قول "ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاء لہٗ" کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ میں شامل نہ ہوسکے، بلکہ ان کے پہنچنے سے پہلے نمازِ جنازہ ہوگئی تو اس وقت انہوں نے مذکورہ بالا جملہ ارشاد فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ مجھ سے فوت ہوگئی اور سوائے متولی کے کوئی شخص نمازِ جنازہ کا اعادہ نہیں کرسکتا، لہٰذا مجھے دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن اب مجھ سے میّت کے لئے دُعا و استغفار تو ہوسکتا ہے، اور میت کے لئے دُعا و استغفار پوری زندگی کا وظیفہ ہے جو کہ خاص وقت یا موقع و محل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اور میں جب چاہوں گا اُن کے لئے دُعا و استغفار کرتا

رہوں گا، اور اس عام دُعا و استغفار میں آپ مجھ سے سبقت نہیں کر سکتے، بلکہ ان انفرادی دُعاؤں میں، میں تم سے سبقت لے جاؤں گا، یعنی میں کثرت سے ان کے لئے دُعائے مغفرت کرتا رہوں گا، تم مجھ سے اس میں سبقت نہیں کر سکتے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا اشارہ قرآن مجید کی اس دُعا کی طرف تھا جو کہ خود اللہ تعالیٰ نے مرحومین کے لئے تعلیم فرمائی: "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ ..... الآیة." (الحشر:۱۰)

پس حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے قول: "فلا تسبقونی بالدعاء لهٗ" سے اس خاص موقع کی دُعا مراد نہیں ہے، بلکہ عام دُعا مراد ہے جو کہ انفرادی طور پر مرحومین کے لئے مانگی جاتی ہے۔ اگر علامہ صاحب کو اصرار ہے کہ یہاں انفرادی دُعا مراد نہیں بلکہ اجتماعی دُعا مراد ہے تو پھر بھی علامہ صاحب کو یہ بات مفید نہیں ہوگی، کیونکہ کوئی ایسا قرینہ عبارت میں موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہوجائے کہ یہ اجتماعی دُعا نمازِ جنازہ کے متصل بعد مانگی گئی، بلکہ پھر تو دُعا سے مراد دفن کے بعد والی دُعا ہے اور قرینہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کا رواج اس دور میں نہیں تھا، اور دفن کے بعد دُعا کا طریقہ اس دور میں رائج تھا، خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ میّت کے لئے دفن کے بعد استغفار کرو اور ثابت قدمی کی دُعا مانگو۔ (مشکوٰۃ ص:۲۶) بہرحال حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے قول سے عام دُعا مراد ہے، جس کا کسی خاص موقع سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اگر اس سے کسی خاص موقع کی دُعا مراد لی جاسکتی ہے تو وہ موقع دفن کے بعد کا ہے، نہ کہ نمازِ جنازہ کے بعد کا، اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں پر غور فرمائیں، انشاء اللہ شرحِ صدر ہوجائے گا:

۱:... حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے حضرت عمرؓ کی نمازِ جنازہ فوت ہوگئی اور بعد میں پہنچے، لیکن کتنی دیر بعد پہنچے؟ اس کی کوئی وضاحت روایت میں موجود نہیں کہ ابھی چارپائی رکھی تھی یا اُٹھالی گئی تھی، دفن سے پہلے پہنچے یا دفن کے بعد فوراً پہنچے یا دیر سے؟

ایک پہر کے بعد یا آدھے پہر کے بعد؟ کیا علامہ صاحب بتلا سکتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ فوراً پہنچ گئے اور ابھی چارپائی اپنے مقام میں رکھی تھی؟ اگر یہ ثابت کردیں تو سچے اور اگر چارپائی کا اپنے مقام پر موجود ہونا ثابت نہیں کرسکتے اور یقیناً نہیں کرسکتے تو علامہ صاحب کی خاص دُعا کیسے ثابت ہوگی؟ جبکہ علامہ صاحب کی خاص دُعا کے ''ارکان'' میں سے ایک رُکن یہ بھی ہے کہ دُعا کے وقت چارپائی سامنے رکھی ہو، اسی لئے تو یہ حضرات جنازہ کے بعد چارپائی ہرگز نہیں اُٹھانے دیتے، بلکہ چارپائی کے گرد جمع ہوجاتے ہیں، اور اگر کوئی شخص چارپائی کو اُٹھانے کی کوشش کرے تو چارپائی کو پکڑ لیتے ہیں اور سامنے رکھ کر دُعا مانگنے کو لازمی خیال کرتے ہیں، پس اگر حضرت عمرؓ کی چارپائی کا سامنے موجود ہونا علامہ صاحب سے ثابت ہوگیا تو علامہ صاحب کی خاص موقع کی دُعا ثابت ہوگی، ورنہ ''فلا تسبقونی بالدعاء لہٗ'' سے عام دُعا مراد ہوگی جو عموماً زندہ لوگ اپنے مردوں کے لئے مانگا کرتے ہیں۔ مثلاً: کسی صحابی کا نام لیتے وقت ''رضی اللہ عنہ'' کہنا اور کسی ولی اللہ کے نام کے ساتھ ''رحمہ اللہ'' یا ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہہ دینا وغیرہ۔

مجھے اُمید ہے کہ اب علامہ صاحب اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کتبِ حدیث، تفسیر اور تاریخ کی ورق گردانی ضرور کریں گے، لیکن دورانِ مطالعہ ذرا اس حدیث شریف کو سامنے رکھیں: ''اسرعوا بالجنائز'' یعنی میّت کی روانگی میں جلدی کرو، کیونکہ اس معاملہ میں تاخیر ممنوع ہے، اس فرمانِ شرعی کو سامنے رکھتے ہوئے ثابت فرمائیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے لئے چارپائی رکھ کر یہ تاخیر گوارا کرلی تھی؟ دیدہ باید!

۲:... حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاء لہٗ'' علامہ صاحب مبسوط سرخسی سے نقل فرماتے ہیں، اور یہ کتاب امام سرخسی رحمہ اللہ کی تالیف کردہ ہے، اور یہ کتاب فقہ حنفیہ کی اُصولی اور

بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اگر حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے مذکورہ بالا قول سے دُعا بعد الجنازہ کا ثبوت ملتا تو امام سرخسی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''مبسوط'' میں دُعا بعد الجنازہ کو ثابت کرتے اور استدلال کے طور پر اس کو پیش کرتے، لیکن حضرتِ امام سرخسی رحمہ اللہ نے ''مبسوط'' میں نمازِ جنازہ کی پوری ترکیب لکھی ہے اور دُعا بعد الجنازہ کو نہیں لکھا اور نہ ہی اس موقع پر اس قول کو نقل کیا، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قول سے خاص موقع کی دُعا بعد الجنازہ ثابت نہیں ہوتی، ورنہ امام سرخسی رحمہ اللہ ضرور ثابت فرماتے اور ''مبسوط'' میں اس کو لکھتے، حالانکہ ''مبسوط'' فقہ کی کتاب ہے اور اس میں فقہ کے مسائل مع دلائل درج ہیں، لیکن دُعا بعد الجنازہ کا مسئلہ اس میں لکھا ہوا نہیں ہے، سچ کہا کسی نے: ''مدعی سست، گواہ چست!''

اگر بالفرض امام سرخسی رحمہ اللہ نے اس قول سے دُعا بعد الجنازہ ثابت نہیں کی تو ان کے بعد لاکھوں فقہائے کرامؒ دنیا میں تشریف لائے جنہوں نے ''مبسوط سرخسی'' کو پڑھا اور پڑھایا اور اس کو سامنے رکھ کر فقہ میں کتابیں تألیف کیں، حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا قول ان کے سامنے رہا، لیکن کسی فقیہ نے اس قول سے دُعا بعد الجنازہ کو ثابت نہیں کیا، ثابت کیا کرتے؟ ان حضرات نے تو خود اس خاص موقع کی دُعا سے منع کردیا اور اس کے لئے ٹھہرنے کی کسی کو اجازت تک نہیں دی، یہ کیسا استدلال ہے کہ امام سرخسی رحمہ اللہ سے لے کر آج تک تمام فقہائے کرامؒ کی آنکھوں سے اوجھل رہا اور علامہ کے سامنے روشن ہوگیا، بہرحال اگر حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے قول سے دُعا بعد الجنازہ کا ثبوت ملتا تو سب سے پہلے اس قول کے ناقل امام سرخسی رحمہ اللہ اس دُعا بعد الجنازہ کو ثابت کرتے اور بعد والے فقہائے کرامؒ جو کہ امام سرخسیؒ کی کتابوں کے خوشہ چین ہیں وہ بھی ثابت کرتے، ان سب حضرات کا اس قول سے دُعا بعد الجنازہ کو ثابت نہ کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ اس سے دُعا بعد الجنازہ سرے سے ثابت ہی نہیں ہوتی۔

اب آپ سوچ میں پڑجائیں گے کہ جب امام سرخسیؒ نے اس قول سے دُعا بعد الجنازہ کو ثابت نہیں کیا تو اس کو اپنی کتاب ''مبسوط'' میں کیوں لائے؟ کہاں لائے اور کیا ثابت کیا؟ تو گزارش ہے کہ امام سرخسی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مبسوط'' میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ نمازِ جنازہ کا تکرار اور اعادہ نہیں ہوتا، ہاں! اگر متولی نمازِ جنازہ سے رہ جائے تو اس کو اعادہ کا حق ہے، اور کوئی شخص دوبارہ، سہ بارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھ سکتا، اور اسی مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل کے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا یہ قول پیش کرتے ہیں: ''ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیه فلا تسبقونی بالدعاء لهٗ'' یعنی نمازِ جنازہ تو تم نے پڑھ لیا اور اس میں مجھ سے سبقت لے گئے، اور میں دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھ سکتا، کیونکہ نمازِ جنازہ کا تکرار نہیں ہوتا، لیکن دُعا استغفار میں تم مجھ سے سبقت نہیں کرسکتے ہو، کیونکہ دُعا و استغفار ایک انفرادی عمل ہے جو کہ زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے گاہ بگاہ جاری رہتا ہے، لہٰذا دُعا و استغفار میں تم مجھ سے سبقت نہیں کرسکو گے، بلکہ میں تم سے سبقت لے جاؤں گا، پس امام سرخسی رحمہ اللہ نے تو اس قول سے ثابت کیا کہ جب ایک دفعہ نمازِ جنازہ ہوجائے تو سوائے متولی کے کسی کو دوبارہ پڑھنے کا حق نہیں ہے۔ آپ پوری ''مبسوط'' پڑھ لیں امام سرخسی رحمہ اللہ نے کہیں بھی اس سے دُعا بعد الجنازہ ثابت نہیں کی۔ اگر علامہ صاحب اس سے دُعا بعد الجنازہ ثابت کرتے ہیں تو کیا یہ امام سرخسی رحمہ اللہ سے بھی بڑے عالم اور فقیہ ہیں؟

ہاں! اس سے اگر کوئی اور چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ زندوں کو چاہئے کہ مردوں کے حق میں عموماً دُعا و استغفار کیا کریں اور زندوں کے دُعا و استغفار سے مردوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور یہی اہلِ سنت والجماعت کا مسلکِ حقہ ہے۔

۳:... علامہ صاحب جس دُعا بعد الجنازہ کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ تو ہاتھ اُٹھا کر مانگی جاتی ہے، بلکہ اس میں ہاتھ اُٹھانا ''رکن'' ہے، ضروری ہے،

جو شخص دُعا کے ساتھ ہاتھ نہ اُٹھائے بلکہ دِل دِل میں میّت کے لئے دُعا کرتا رہے تو اُس کو ملامت کی جاتی ہے اور دُعا کا منکر سمجھا جاتا ہے، لہٰذا علامہ صاحب کی دُعا وہ ہے جس میں ہاتھ اُٹھانا ضروری ہے اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے قول میں ہاتھ اُٹھانے کا ذکر تک بھی نہیں ہے، لہٰذا قولِ مذکور سے عام دُعا مراد ہے جو وقتاً فوقتاً بلاقیدِ زمان ومکان مانگی جاتی ہے، اہلِ بدعت کی دُعائے مخصوصہ مراد نہیں ہے۔

قارئینِ کرام! جو منصف مزاج آدمی ہماری پیش کردہ مذکورہ بالا تینوں گزارشات میں غور کرے گا... انشاً اللہ... وہ بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی مراد وہ عام انفرادی دُعا ہے جو گاہ بگاہ بلاتخصیص اموات کے لئے مانگی جاتی ہے، اگر علامہ صاحب اصرار کرتے ہیں کہ اس سے خاص اجتماعی دُعا مراد ہے تو وہ خاص موقع دفنِ میّت کے بعد کا ہے، کیونکہ اس خاص موقع کی دُعا کا ثبوت احادیثِ صحیحہ سے ہے، نمازِ جنازہ کے متصل بعد والا موقع مراد نہیں ہے، کیونکہ اس موقع کی دُعا حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

الحمد للہ! دلائل سے ثابت ہوگیا کہ دُعا بعد الجنازہ کسی صحابیٔ رسول کا نظریہ نہیں ہے، علامہ صاحب نے خواہ مخواہ ایک غلط نظریہ کی نسبت اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کردی ہے، ہم نے اس نظریہ کا غلط ہونا واضح کرکے اصحابِ رسولؐ کے دامن کا اس قسم کی بدعات سے پاک وصاف ہونا ثابت کردیا ہے۔

علامہ صاحب کا ظالمانہ فتویٰ:

علامہ صاحب لکھتے ہیں:

> ”جو شخص نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کا منکر ہے اور اسے گمراہی اور حرام و ناجائز قرار دیتا ہے، وہ صحابیٔ رسول عبداللہ بن سلام اور دیگر صحابہ کا منکر اور گستاخ ہے۔“
>
> (نظریاتِ صحابہ ص:۲۱)

دیکھئے! علامہ صاحب کس دلیری سے خودساختہ دُعا کے منکرین پر فتویٰ صادر فرمارہے ہیں، حالانکہ یہ دُعا نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے اور نہ ہی خیرالقرون سے اس کا ثبوت ملتا ہے، بلکہ بعد کی ایجاد ہے، لیکن علامہ صاحب نے اس کو پہلے بزورِ بازو ''نظریۂ صحابہ'' بنایا اور پھر انکار کرنے والوں کو گستاخِ صحابہ بنادیا، یہ ہے علامہ صاحب کا زورِ قلم...زورِ علم...اور زورِ فتویٰ... حالانکہ اُصولی بات یہ ہے کہ آدمی کو فتویٰ دینے میں بڑی احتیاط کرنی چاہئے، اور سوچ و بچار اور تحقیق کے بعد فتویٰ لگانا چاہئے، کیونکہ بعض اوقات ایک طرف صحابیٔ رسولؐ کا عمل ہوتا ہے اور اس کے مدمقابل بھی ایک صحابیٔ رسولؐ کا عمل ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں فتویٰ بازی بالکل جائز نہیں ہے، کیونکہ دونوں طرف اصحابِ رسولؐ کا عمل ہے اور ممکن ہے کہ شریعت کی رُو سے دونوں عمل صحیح ہوں، یہی وجہ ہے کہ بعض اختلاف رحمت ہوتے ہیں، جیسے ائمہ اربعہ کے مسلک کے اختلاف کی بنیاد اصحابِ کرامؓ کی مختلف روایات ہیں، ہر امام کے پاس عملِ رسولؐ اور عملِ صحابہ کا مستند ذخیرہ ہے، لیکن کسی ایک امام کے پیروکاروں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے امام کے پیروکاروں پر منکرِ صحابہ اور گستاخِ صحابہ کا فتویٰ لگادیں، کیونکہ یہاں تو دونوں طرف عملِ صحابہ ہے، یہاں جو فتویٰ بازی کرے گا وہ اپنی عاقبت خراب کرے گا، کیونکہ جس جانب اس کے فتویٰ کا رُخ ہے ادھر بھی عملِ صحابہ ہے، لہٰذا فتویٰ بازی میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے ورنہ اپنے ایمان کا خطرہ ہے۔ یہ اُصولی بات لکھنے سے میرا مقصد علامہ صاحب کی بے اُصولی کو واضح کرنا ہے کہ وہ ازخود ایک عمل کو ''نظریۂ صحابہ'' بنالیتے ہیں اور پھر بلا تحقیق دوسری جانب فتویٰ لگادیتے ہیں۔

اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ علامہ صاحب نے جو ''اعمال ونظریاتِ صحابہ'' بیان کئے ہیں وہ صحابہ کرامؓ کے اعمال ونظریات ہیں، نہیں! نہیں! ہرگز نہیں! علامہ صاحب نے جن اعمال ونظریات کی نسبت صحابہ کرامؓ کی طرف کی ہے یہ نسبت

ہی غلط ہے، صحابہ کرامؓ کے یہ اعمال ونظریات ہرگز نہیں تھے، ان کے نفوسِ قدسیہ ان غلط اعمال ونظریات سے پاک وصاف اور منزہ تھے، علامہ صاحب نے خواہ مخواہ اپنے رسالہ کا نام ''نظریاتِ صحابہ'' رکھ دیا ہے، علامہ صاحب کے بیان کردہ عقائد کو نظریاتِ صحابہ نہیں کہنا چاہئے، ہاں! ان کو ''نظریاتِ رضاخانیہ''، ''نظریاتِ نعیمیہ''، ''نظریاتِ سعیدیہ''، ''نظریات فیضیہ'' یا پھر ''نظریاتِ بریلویہ'' کہنا زیادہ موزوں ومناسب ہے۔

علامہ صاحب کے فتویٰ کی زد میں آنے والے مظلوم فقہائے کرامؒ:

علامہ صاحب سمجھتے ہیں کہ دُعا بعد الجنازہ سے منع کرنے والے علمائے دیوبند ہیں، اسی لئے دیر نہیں کی اور جھٹ فتویٰ لگادیا کہ جو شخص نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کا منکر ہے اور اسے گمراہی اور ناجائز قرار دیتا ہے وہ صحابیٔ رسول عبداللہ بن سلامؓ اور دیگر صحابہ کا منکر اور گستاخ ہے۔

علامہ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس خودساختہ جعلی دُعا کے منکر صرف علمائے دیوبند نہیں، بلکہ پوری اُمت کے فقہاً اور علماً اس بدعت کے منکر ہیں، اور اس نئی ایجادِ بندہ سے منع کرتے ہیں، چند فقہاً کے نام بھی سن لیجئے جنہوں نے خاص طور پر اپنی کتابوں میں صراحۃً اس بدعت سے منع کیا ہے اور اس کو ناجائز لکھا ہے، اور علامہ صاحب کو بھی دعوتِ فکر دوں گا کہ دیکھیں! آپ کے فتویٰ کی زد کن پر پڑتی ہے، مختصراً ان کے نام ذکر کرتا ہوں:

۱:...امام ابوبکر بن حامد الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۲۶۴ھ) صاحب الحیط۔

۲:...شمس الائمہ حلوانی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۵۴ھ)۔

۳:... بخارا کے مفتی قاضی شیخ الاسلام علامہ سفدی الحنفی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۶۱ھ)۔

۴:...امام طاہر بن احمد البخاری الحنفی رحمہ اللہ (التوفی ۵۴۲ھ)۔

۵:...علامہ سراج الدین اودی الحنفی رحمہ اللہ۔

۶:...امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردی الحنفی رحمہ اللہ (التوفی ۸۲۷ھ)۔

۷:...امام شمس الدین محمد خراسانی کوہستانی الحنفی رحمہ اللہ (التوفی ۹۲۶ھ)۔

۸:...علامہ فہامہ ابوحنیفۂ ثانی ابنِ نجیم الحنفی رحمہ اللہ۔

۹:...مفتی محمد نصیرالدین الحنفی رحمہ اللہ۔

۱۰:...حضرت علامہ مُلّا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ۔

۱۱:...مصنف مجموعہ خانی رحمہ اللہ۔

۱۲:...حضرت مولانا مفتی سعداللہ صاحب الحنفی محشی ''ما لا بد منہ'' (التوفی ۱۲۹۲ھ)۔

۱۳:...حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمہ اللہ۔

۱۴:...علامہ برجندی الحنفی رحمہ اللہ۔

۱۵:...ابن الامیر الحاج رحمہ اللہ۔

۱۶:...نواب قطب الدین صاحب رحمہ اللہ شارحِ مشکوٰۃ۔

۱۷:...شیخ الاسلام علامہ ابوبکر بن علی الحداد الیمنی، صاحب الجوہرہ النیرہ۔

آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے:

مذکورہ بالا حضرات تفقہ فی الدین کے آسمان کے تابندہ ستارے ہیں، جن کی طرف منہ کرکے ہمارے علامہ صاحب ''منکرِ صحابہ'' و ''گستاخِ صحابہ'' کا فتویٰ تھوک رہے ہیں، لیکن یقین جانئے آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے، چونکہ مذکورہ بالا فقہائے کرامؒ علومِ شریعت کے مضبوط پہاڑ ہیں اور رُموزِ دین کے سمندر ہیں، اس لئے علامہ صاحب کے فتویٰ کا ان پر تو کوئی اثر نہیں ہوگا لیکن علامہ صاحب کے منہ سے نکلی ہوئی

بات کو اللہ تعالیٰ ضائع بھی نہیں فرمائیں گے، لہٰذا علامہ صاحب کا فتویٰ خود علامہ صاحب کے گلے کا ہار بنے گا، کیونکہ فوّارہ کا نکلا ہوا پانی بالآخر فوّارہ ہی میں واپس جاتا ہے، نامعلوم علامہ صاحب نے فتویٔ کفر کی مشین کہاں سے حاصل کی ہے؟ شاید اپنے امام احمد رضا خان صاحب فاضلِ بریلوی سے ان کو ورثہ میں ملی ہے۔

علامہ صاحب کے لئے خوشی کا مقام اور پھر اس کا انجام:

چونکہ جمہور فقہائے کرامؒ دُعا بعد الجنازہ سے منع کرتے ہیں، جن میں سترہ حضرات کے نام آپ نے دیکھ لئے، لیکن علامہ صاحب امام فضلیؒ کے قول "لا بـأس بہٖ" کو دیکھ کر شاید خوش ہوجائیں، تو ان کو خوش نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ کلمہ "لا بـأس بـــہٖ" اکثر غیر اَولیٰ اور غیر مستحب اُمور میں استعمال ہوتا ہے، دیکھیں: شامی جلد:۱ ص:۸۸، جلد:۱ ص:۴۸۷، بہرحال جب یہ کلمہ خلافِ اَولیٰ اور غیر مستحب میں استعمال ہوگا تو کراہتِ تنزیہی سے خالی نہیں ہوگا، اسی لئے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے امام ابوبکر صاحبُ المحیط اور امام فضلیؒ کے اقوال میں یوں تطبیق دی ہے:

> "ایک صاف اور واضح تطبیق امام محمد بن الفضلؒ اور امام ابوبکر بن حامدؒ کے کلام میں یہ ہوسکتی ہے کہ اَوّل الذکر (امام فضلیؒ) مکروہِ تنزیہی اور مؤخر الذکر (امام ابوبکرؒ) مکروہِ تحریمی فرماتے ہیں، اور ظاہر یہی ہے، کیونکہ اکثر کتبِ فقہ و فتاویٰ میں اَوّل اصل مذہب یہی بیان کیا ہے کہ دُعا نہ کرے، یا دُعا مکروہ ہے، اور کراہتِ مطلقہ سے اکثری طور پر تحریمی ہی مراد ہوتی ہے، اور امام محمد بن الفضلؒ سے اس کے خلاف جو قول نقل کیا، اُس کو لا بـأس سے تعبیر کیا، جو اصل معنی کے لحاظ سے کراہتِ تنزیہی یا

کم از کم خلافِ اَوْلیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔“

(دلیل الخیرات فی ترک المنکرات ص:۴۹)

پس معلوم ہوا کہ امام فضلیؒ **لا بأس** فرما کر اس کو جائز اور ثابت نہیں کر رہے، بلکہ مکروہِ تنزیہی اور غیر اَوْلیٰ ہونا بیان کر رہے ہیں، لہٰذا علامہ صاحب کو امام فضلیؒ کے قول پر خوش نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ بقیہ فقہائے کرامؒ اس کو مکروہِ تحریمی اور ناجائز لکھتے ہیں، اور امام فضلیؒ اس کو مکروہِ تنزیہی سمجھتے ہوئے **لا بأس** فرما رہے ہیں، بہرحال دُعا بعد الجنازہ مکروہ عند الفقہاءؒ ہے، خواہ تحریمی ہو یا تنزیہی۔

نمبر ۷:... علامہ صاحب اس نمبر میں لکھتے ہیں:

”حضرت بلال رضی اللہ عنہ صحابی مؤذّن، اذان کے بعد پڑھتے تھے السلام علیک یا رسول اللہ۔“

الجواب:

علامہ صاحب نے یہ روایت تو لکھ دی لیکن اپنی عادت کے مطابق اس سے اخذ کردہ نتیجہ تحریر نہیں فرمایا، اور کوئی فتویٰ بھی نہیں لگایا، لیکن ظاہر ہے کہ علامہ صاحب اس سے اذان کے بعد مروّجہ صلوٰۃ وسلام کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور استدلال اس روایت سے کرتے ہیں، لیکن علامہ صاحب کا استدلال باطل ہے۔

اَوّلاً:... اس لئے کہ اس روایت کا ایک راوی کامل ابوالعلاءؒ منکر الحدیث ہے، چنانچہ علامہ ابوالفضل محمد بن طاہر المقدسی المعروف بابن القیرانی المتوفی ۵۰۷ھ لکھتے ہیں:

”ان المؤذّن کان یأتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیقول: السلام علیک یا رسول اللہ! حی علی الصلوٰۃ. فیہ کامل ابو العلاء منکر الحدیث.“

(معرفۃ التذکرۃ ص:۱۲۶)

ترجمہ:... ''یہ روایت کہ: مؤذّن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ''السلام علیک یا رسول اللہ! آیئے نماز کی طرف'' کہتا تھا، منکر ہے، کیونکہ اس میں کامل ابوالعلاً منکر الحدیث ہے۔''

جب سرے سے روایت صحیح نہیں، بلکہ منکر ہے، تو علامہ صاحب کا استدلال خود بخود باطل ہے۔

ثانیاً:... برسبیل تنزل اگر علامہ صاحب کی پیش کردہ روایت کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو پھر بھی ان کا اس سے استدلال کرنا باطل ہے، کیونکہ اس روایت کا صاف صریح اور صحیح مطلب یہ ہے کہ: مؤذّنِ رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ، اذان سے فارغ ہوکر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاعِ نماز کے لئے آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے، پہلے آپ کو سلام عرض کرتے، پھر نماز کی اطلاع کرتے، یہی طریقہ تمام صحابہ کرامؓ کا تھا کہ جس مقصد کے لئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو پہلے آپ کو سلام عرض کرتے، پھر آنے کا مقصد پیش کرتے، اور یہی اسلامی طریقہ ہے کہ جب بھی کوئی مسلمان کسی مسلمان کو ملے تو سب سے پہلے سلام کرے، پھر کوئی اور بات، پس حضرت بلالؓ بھی اسی دستورِ اسلامی کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر سلام عرض کرتے تھے۔

اذان کے بعد مروّجہ صلوٰۃ وسلام کے ساتھ اس کو کوئی تعلق نہیں، لیکن کمال کردیا علامہ صاحب کے قلم نے کہ اس روایت کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ عام پڑھنے والے کو دھوکا لگ جائے کہ سچ مچ حضرت بلالؓ اذان کے بعد سلام پڑھتے تھے، علامہ صاحب! نہ دھوکا کھایئے اور نہ دھوکا دیجئے، حضرت بلالؓ اذان کے بعد مروّجہ صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھتے تھے اور یقیناً نہیں پڑھتے تھے، وہ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلامی طریقہ کے مطابق سلام عرض کرتے تھے،

یہی وجہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی کے وقت حضرت بلالؓ سلام عرض نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود نہیں ہوتے تھے، اور جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے تو پھر بھی حضرت بلالؓ یہ سلام عرض نہیں کرتے تھے، کیونکہ مقصد تو تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دینا، اور اس اطلاع سے پہلے سلام عرض کرتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی کی صورت میں نہ اطلاع کی ضرورت درپیش آتی تھی اور نہ ہی سلام عرض کرنے کی نوبت۔

چونکہ اذان کے ساتھ صلوٰۃ وسلام کا مسئلہ چل پڑا، لہٰذا اس مسئلہ کے متعلق ضروری گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔

اذان کے اوّل میں مروّجہ صلوٰۃ وسلام کی ابتدا:

بریلوی حضرات کی مساجد میں اذان سے پہلے مروّجہ صلوٰۃ وسلام کا رواج غالباً چودھویں صدی میں شروع ہوا ہے، کیونکہ اس کا بدعت ہونے کی حیثیت سے بھی کتابوں میں تذکرہ نہیں ملتا ہے، گویا یہ مروّجہ صلوٰۃ وسلام اس دور کی ایجاد ہے، اور چودھویں صدی میں اس بدعت کو اذان کے اوّل میں ملا کر اس کو دین و مذہب کا درجہ دے دیا گیا، میری دانست کے مطابق بریلویوں سے سنجیدہ لوگ اس احداث فی الدین کو اچھا نہیں سمجھتے، بلکہ اپنے ہم مسلک لوگوں کو اس کے چھوڑ دینے کا بھی مشورہ دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بریلویوں کی بعض مساجد میں اذان کے شروع میں مروّجہ صلوٰۃ و سلام نہیں کہا جاتا ہے۔

اذان کے بعد مروّجہ سلام خوانی کی ملاوٹ اور اس کی ابتدا:

اذان کے بعد مروّجہ سلام خوانی ساتویں صدی ہجری میں شروع کی گئی، پوری سات صدیاں اس بدعت سے خالی نظر آتی ہیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان

کے بعد یہ سلام خوانی نہیں کرائی اور نہ ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دوسرے کسی مؤذن کو اس کا حکم دیا، خلفائے راشدینؓ کے دورِ مسعود میں بھی اذان کے آخر میں یہ مروّجہ صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھے جاتے تھے، خیرالقرون میں بھی اس کا رواج نہیں تھا، بلکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور سے لے کر پورے سات سو سال تک سیدھی سادی اذان مسلمانوں میں جاری رہی، یعنی ''اللہ اکبر'' سے شروع ہوکر ''لا الٰہ الا اللہ'' پر ختم ہوتی تھی، اس عرصہ میں اذان کے اوّل یا آخر میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کی گئی، ہر جگہ، ہر مسجد میں اور ہر طبقہ کے مسلمانوں میں سنت کے مطابق اذانِ بلالی جاری و ساری رہی، لیکن آٹھویں صدی ہجری میں اذان کے بعد سلام خوانی کی رسم شروع کی گئی، چنانچہ بریلویوں کے امام احمد رضاخان صاحب درمختار سے نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''التسليم بعد الاذان حدث في ربيع الأخر ۷۸۱ھ سبع مائة واحدى وثمانين في عشاء ليلة الاثنين.'' (أحکامِ شریعت ج:۱ ص:۶۵)

یعنی اذان کے بعد سلام خوانی ربیع الآخر ۷۸۱ھ میں شروع ہوئی اور وہ بھی سوموار کے دن صرف عشأ کی اذان میں سلام خوانی ہوتی تھی۔ دس سال تک تو یہ سلام خوانی ہفتہ میں ایک دن اور وہ بھی صرف ایک نمازِ عشأ کی اذان میں چلتی رہی، لیکن درمختار جلد:۱ صفحہ:۲۸۷ پر ہامش ردالمحتار میں لکھا ہے کہ: پھر نمازِ جمعہ کی اذان میں اس کا اضافہ کیا گیا، اور پھر دس سال بعد سوائے مغرب کے بقیہ نمازوں کی اذانوں میں بھی اس کو شامل کرلیا گیا، پھر کچھ عرصہ بعد مغرب کی اذان میں بھی یہ سلام خوانی شروع کردی گئی۔

قارئینِ کرام! یہ ہے مروّجہ صلوٰۃ وسلام کی ابتدائی تاریخ اور کہانی، جس کو آپ نے اعلیٰ حضرت کی زبانی سن لیا کہ یہ بدعت ۷۸۱ھ میں ایجاد کرکے اذان میں

شامل کردی گئی۔

وجہ ایجاد:

مروّجہ سلام خوانی جو ۷۸۱ھ میں جاری کی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس دور میں مصر میں فاطمی سلاطین کی حکومت تھی، اور سلاطینِ فاطمیہ مذہباً اسماعیلی شیعہ تھے، انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں اذان کے بعد امام ظاہر پر سلام کرنے کا رواج جاری کر رکھا تھا، اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب شیعہ اقتدار کو ختم کر کے ملکِ مصر فتح کیا تو ان کو اذان کے بعد کہے جانے والے ''السلام علی الامام الظاہر'' کے ختم کرنے کی فکر لاحق ہوئی، لیکن مصر والوں پر سابقہ شیعہ حکومت کے اثرات باقی تھے، چنانچہ اس بدعتِ قبیحہ کو یکسر ختم کرنے میں اہلِ مصر کی طرف سے سلطانِ مذکور کو بغاوت اور شورش برپا کرنے کا خطرہ محسوس ہوا، کیونکہ اس کی نئی نئی حکومت بنی تھی، اس خطرہ کے پیشِ نظر سلطان صلاح الدین ایوبی اس بدعت کو فوراً ختم نہ کرسکے، بلکہ وقتی طور پر مصلحتاً اس کا امالہ کردیا، پس اس نے ''السلام علی الملک الظاہر'' کی بجائے ''السلام علیٰ رسول اللہ'' شروع کرادیا، ان کی اس حکمتِ عملی کی وجہ سے ''السلام علی الملک الظاہر'' کا رواج ختم ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد جب ان کی حکومت کو استحکام حاصل ہوا اور شیعہ حکومت کے اثرات بھی زائل ہوئے تو رفتہ رفتہ ''السلام علیٰ رسول اللہ'' کا رواج بھی جاتا رہا، یہی وجہ ہے کہ مصر میں آج بھی اذان کے بعد سلام خوانی نہیں ہوتی، سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس سلام خوانی کو دین اور عبادت سمجھ کر شروع نہیں کرایا اور نہ ہی وہ اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، بلکہ ایک بہت بڑی بدعتِ قبیحہ کو مٹانے کے لئے انہوں نے اس کو وقتی طور پر گوارا کرلیا۔

بدعتِ حسنہ کا مطلب:

جن علماً نے اذان کے بعد سلام خوانی کو بدعتِ حسنہ کہا ہے، ان کا مطلب

یہی ہے کہ چونکہ اس بدعت کے ذریعہ ایک بہت بڑی بدعتِ قبیحہ کو مٹایا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ حسنہ ہے، یا دوسرے لفظوں میں سلام خوانی والی بدعت شیعوں والی بدعت سے نسبتاً اچھی ہے، ورنہ فی نفسہٖ اس میں کوئی خوبی اور اچھائی نہیں، بلکہ بدعت اور احداث فی الدین ہونے میں دونوں برابر ہیں، البتہ نسبتاً ایک بدعت دوسری بدعت سے اچھی ہے، شاید سلطان صلاح الدین ایوبی کے پیشِ نظر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہو کہ جو شخص دو مصیبتوں میں سے ایک مصیبت میں لازماً مبتلا ہونے کا خطرہ محسوس کر رہا ہو تو اس کو اھون البلیّتین کو اختیار کرنا چاہئے، یعنی دو مصیبتوں میں سے جو نسبتاً ہلکی اور آسان ہو اس کو اختیار کرے، چونکہ سلطان صاحب بھی اسی میں مبتلا تھے اسی لئے اھون البلیّتین کو اختیار کیا، یہ ہے بدعتِ حسنہ کا مطلب، کیونکہ شرعی بدعت میں کسی قسم کی بھلائی اور خوبی نہیں ہوتی اور نہ اس کو فی نفسہٖ حسنہ کہا جاتا ہے، البتہ بہ نسبت غیر کے اس کو کبھی حسنہ بھی کہہ دیا جاتا ہے، امامِ ربانی حضرت مجدد الفِ ثانی قدس سرہٗ نے کیا خوب فرمایا ہے:

> ''فقیر، کسی بدعت میں حسن نہیں دیکھتا، نہ اس میں کسی قسم کی نورانیت محسوس کرتا ہے، نور تو صرف سنت میں ہے، اور بدعت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

پس ثابت ہوا کہ اذان کے اوّل میں سلام خوانی بدعتِ قبیحہ ہے، اور اذان کے بعد بھی بدعت ہے، البتہ نسبتاً حسنہ ہے، بہرحال ہے بدعت، اور اس کے بدعت ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے، اسی لئے تو ''بہارِ شریعت'' کے مؤلف مولانا حکیم ابوالعلی محمد امجد علی صاحب اعظمی رضوی نے اذان سے پہلے والی سلام خوانی کا تذکرہ تک نہیں کیا، شاید وہ اس کے قائل ہی نہیں، اسی لئے اس کو ذکر نہیں کیا، البتہ اذان کے بعد والے سلام کو تثویب کے ضمن میں ذکر کیا، لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کردی کہ یہ سلام خوانی متأخرین (بعد کے لوگوں) کی ایجاد ہے، اور یہی وجہ ہے کہ

پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پور ضلع سیالکوٹ کے پیروکاروں نے اس مسئلہ میں بریلویوں کی کھل کر مخالفت کی ہے۔

مزید اضافہ:

آپ کو معلوم ہوگیا کہ مروّجہ صلوٰۃ وسلام ۷۸۱ھ میں شروع کی گئی، لیکن اس کے الفاظ صرف اتنے تھے: ''السلام علیک یا رسول اللہ'' جس کو ایک حیثیت سے بدعتِ حسنہ کا درجہ بھی دیا گیا، لیکن پاک و ہند کے بریلویوں نے اس میں مزید اضافے بھی کیے ہیں، مثلاً: ''السلام علیک یا نور من نور اللہ''، ''اغثنی یا رسول اللہ''، ''ادرکنی یا حبیب اللہ'' وغیرہ، کیا علامہ صاحب ثابت کرسکتے ہیں کہ یہ مزید اضافے کہاں لکھے ہیں؟ کیا کسی فقیہ نے ان کو بھی بدعتِ حسنہ کا درجہ دیا ہے؟ اگر دیا ہے تو ثابت کریں! اگر اس اضافہ کا کہیں بھی ثبوت نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے، تو کیا آپ لوگوں کو اذان و نماز وغیرہ عبادات میں اضافہ کرنے کا حق حاصل ہوگیا ہے...؟ اگر آپ لوگوں کو عبادات میں ترمیم و اضافہ کا حق حاصل ہے تو اذان کے آخری کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کے بعد متصل ''محمد رسول اللہ'' کا اضافہ بھی کرلیں، کیونکہ ''محمد رسول اللہ'' پیارا کلمہ ہے، اللہ تعالیٰ کے محبوب کا نام ہے، ہر مسلمان کے عقیدہ اور ایمان کا حصہ ہے، اگر کوئی شخص پوری زندگی ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھتا رہے وہ مسلمان نہیں کہلائے گا، جب تک ''محمد رسول اللہ'' کو اس کے ساتھ نہ پڑھے، لہٰذا تم پر تمہاری منطق کے مطابق اذان کے آخری جملہ کے ساتھ ''محمد رسول اللہ'' کا اضافہ لازم ہے، اب سے اس پر عمل کرو اور کراؤ، اور اگر تم لوگوں کو عبادات میں ترمیم و اضافہ کا حق حاصل نہیں، تو اذان کے اوّل و آخر میں سلام خوانی کا اضافہ کیوں کیا؟ ہاں علامہ صاحب! اذان میں ''لا الٰہ الا اللہ'' کے بعد ''محمد رسول اللہ'' شامل کردیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا کہیں اس سے منع کیا گیا ہے...؟ آخر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ گرامی ہے، کیوں اس کو اس مقام

میں شامل نہیں کیا جاتا؟ آخر وجہ کیا ہے...؟

اہلِ سنت یا اہلِ بدعت؟

علامہ صاحب اگر اہلِ سنت ہیں تو ان کو چاہئے کہ اذان سنت کے مطابق دیں، کیونکہ یہ سلام خوانی ہرگز ہرگز سنت سے ثابت نہیں، بلکہ اس کو مستحسن کہنے والے بھی اس کو بدعت کہتے ہیں، البتہ ''حسنہ'' کا لفظ ملاکر دِل کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں، پس اگر علامہ صاحب اس بدعتِ حسنہ پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کرتے ہیں تو اگر بدعتِ حسنہ پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کو ''اہلِ بدعتِ حسنہ'' کہا جائے تو کیا علامہ صاحب اس کو گوارا کرلیں گے؟ دوسرے لفظوں میں علامہ صاحب کو سنی کے بجائے ''حسین وجمیل اور خوبصورت بدعتی'' کا لقب دے دیا جائے تو ناراض تو نہیں ہوں گے...؟

علامہ صاحب کی مذہبی برادری کا ایک حدیث سے استدلال اور اس کا ابطال:

علامہ صاحب کی مذہبی برادری اپنے مروّجہ صلوٰۃ وسلام کو ثابت کرنے کے لئے مسلم اور ابوداوٴد کی ایک روایت سے استدلال کرتی ہے، اور وہ روایت یہ ہے: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اذا سمعتم المؤذّن فقولوا مثل ما یقول، ثم صلُّوا علیَّ فانّہٗ من صلّٰی علیَّ صلوٰۃ صلَّی اللہ علیہٖ عشرًا، ثم سلوا لی الوسیلۃ.''

ترجمہ:...''جب موٴذّن کی اذان سنو، تو جس طرح موٴذّن کہہ رہا ہے، تم بھی اسی طرح کہو، پھر مجھ پر دُرود پڑھو، یقیناً جو شخص مجھ پر ایک دفعہ دُرود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس

رحمتیں نازل فرماتا ہے، پھر میرے لئے وسیلہ کا اللہ تعالیٰ سے سوال کرو۔"

الجواب:

اس حدیث کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ تم جب اذان کی آواز مؤذّن سے سنو تو اس کے ساتھ تم بھی انہی کلمات کو پڑھو جو مؤذّن کہہ رہا ہے، اور جب اذان ختم ہو جائے مجھ پر دُرود پڑھو اور وسیلہ کی دُعا بھی کرو، لیکن جس طرح وسیلہ کی دُعا آہستہ پڑھی جاتی ہے، اسی طرح دُرود بھی آہستہ پڑھنا چاہئے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر پورے سات سو سال تک اسی طرح اس حکم پر عمل ہوتا رہا کہ ہر مسلمان جب اذان سنتا تھا تو مؤذّن کے ساتھ اذان کے کلمات کو دُہراتا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دُرود بھی پڑھتا تھا، اور وسیلہ کی دُعا بھی کرتا تھا، لیکن مروّجہ سلام خوانی کسی نے بھی اس سے نہیں سمجھی، حتیٰ کہ جب ۷۸۱ھ میں اس کو ایجاد کیا گیا تو اس وقت بھی اس کو بدعت کا لقب دیا گیا، البتہ "حسنہ" کہہ کر چشم پوشی کر لی گئی، اگر مروّجہ سلام خوانی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ثابت ہوتی تو اس کو "بدعتِ حسنہ" کیوں کہا گیا؟ کیونکہ پھر یہ تو سنت ہوتی نہ کہ بدعت، اگر حدیث سے مروّجہ صلوٰۃ وسلام ثابت ہے تو امام احمد رضا خان صاحب نے "احکامِ شریعت" میں کیوں فرمایا کہ: "اذان کے بعد سلام پڑھنا ۷۸۱ھ میں ایجاد ہوا" کیا امام احمد رضا خان صاحب اس حدیث کا مفہوم نہیں سمجھتے تھے؟ اگر اس حدیث سے سلام خوانی ثابت ہوتی تو حکیم امجد علی صاحب برکاتی کیوں فرماتے کہ: "سلام خوانی کو متأخرین (بعد کے لوگوں) نے مستحسن سمجھا۔" کیا حکیم امجد علی صاحب اس حدیث کو نہیں سمجھتے تھے، پس ثابت ہوا کہ حدیث کے ٹکڑے "ثم صلّوا علیّ" سے مروّجہ صلوٰۃ وسلام کو ثابت کرنا نری سینہ زوری ہے، کیونکہ حدیثِ پاک کا مفہوم وہی معتبر ہے جو کہ چودہ سو

سال سے سمجھا جاتا رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اذان کا جواب بھی آہستہ آہستہ دینا ہے، اور اذان کے بعد دُرود بھی آہستہ پڑھنا ہے، اور وسیلہ کی دُعا بھی آہستہ پڑھنی ہے۔

علامہ صاحب کو چاہئے کہ پوری حدیث پر عمل کریں:

گزشتہ سطور میں ہم نے عرض کردیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمِ مبارک سے اذان کے ساتھ بلند آواز سے پڑھی جانے والی مروّجہ سلام خوانی ثابت نہیں ہوتی، حتیٰ کہ امام احمد رضاخان صاحب اور حکیم امجد علی صاحب نے بھی اس حدیث سے استدلال نہیں کیا، لیکن اگر علامہ صاحب بضد ہیں کہ اگرچہ پورے چودہ سو سالوں میں کسی عالم، فقیہ یا مجتہد نے اس حدیث سے مروجہ صلوٰۃ وسلام ثابت نہیں کیا، لیکن میں ثابت کرتا ہوں اور پورے چودہ سو سال میں یہ راز کسی پر نہیں کھلا، لیکن مجھ پر کھل گیا، تو ہم دو منٹ کے لئے علامہ صاحب کے دعویٰ کو مان لیتے ہیں، بشرطیکہ علامہ صاحب پوری حدیث پر عمل کریں اور کرائیں، حدیثِ پاک "**اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول**" سے شروع ہوتی ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں اذان سننے والوں کو ہدایات دے رہے ہیں کہ جب تم اذان سنو تو مؤذن کی طرح تم بھی وہ الفاظ دُہراؤ، جب اذان ختم ہو تو مجھ پر دُرود پڑھو اور پھر وسیلہ کی دُعا کرو، پس ثابت ہوا کہ دُرود پڑھنے کا حکم سننے والوں کو ہے اور اس پر سننے والوں نے عمل کرنا ہے، لہٰذا علامہ صاحب اور ان کی تمام مذہبی برادری کو چاہئے کہ اپنے من مانے مطلب کے مطابق حدیث پر یوں عمل کریں کہ اذان ختم ہوتے ہی سب بریلوی بلند آواز سے سلام خوانی کیا کریں تاکہ پوری حدیث پر عمل ہوجائے، اذان ختم ہوتے ہی دُکاندار دُکانوں میں، کسان کھیتوں میں، علماً، طلباً مدرسوں میں، ماسٹر اور بچے اسکولوں میں، راہ گیر راستوں میں اور عورتیں گھروں میں بآوازِ بلند پکارنا شروع کردیا کریں: "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ، الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب

اللہ‘‘ اور روزانہ پانچ وقت اُونچی اُونچی آواز سے ’’ثم صلُّوا عليَّ‘‘ پر عمل کریں۔

علامہ صاحب کی برادری ’’صلُّوا عليَّ‘‘ کو دیکھ کر خوش ہوگئے کہ ماشأ اللہ! اذان کے بعد صلوٰۃ وسلام کا ثبوت مل گیا، لیکن خوشی میں آکر یہ بھول گئے کہ دُرود کا حکم کن کو ہے؟ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کے مخاطب کون ہیں؟ بھائی یہ دُرود شریف کا حکم تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اذان سننے والوں کو دے رہے ہیں، ’’صلُّوا عليَّ‘‘ کا امر مؤذّن کی بجائے سننے والوں کو ہے، کتنی بے انصافی کی بات ہے کہ جن کو حکم ہے وہ تو مروّجہ صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھتے اور جس کو حکم نہیں دیا گیا اُس بیچارے سے باآوازِ بلند سلام خوانی کرائی جاتی ہے، میں حسنِ ظن رکھتا ہوں کہ علامہ صاحب اور ان کی برادری اذان کے بعد دُرود پڑھتے ہوں گے، لیکن مؤذّن کی طرح اُونچی آواز سے نہیں پڑھتے اور یقیناً نہیں پڑھتے، حالانکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم ایسے کہو جیسے مؤذّن کہتا ہے، تو اب بندہ عرض کرتا ہے کہ اے بریلویو! جس طرح تمہارا مؤذّن باآوازِ بلند سلام خوانی کرتا ہے تم بھی اس کی طرح بلند آواز سے سلام خوانی کیا کرو، اور اگر تم بلند آواز سے دُرود نہیں پڑھ سکتے اور یقیناً نہیں کرسکتے تو برائے مہربانی اپنے مؤذّن کو بھی آہستہ دُرود کا حکم دیں، تاکہ مساوات اور برابری ہوجائے، اور ’’مثل ما يقول‘‘ پر عمل بھی پورا پورا ہوجائے۔ مجھے اُمید ہے کہ علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری میری گزارشات پر ٹھنڈے دِل سے غور فرمائیں گے۔

نوٹ:... دُعا بعد الجنازہ ثابت کرنے کے لئے یہ حضرات جن بے اُصولیوں کا ارتکاب کرتے ہیں بعینہٖ اذان کے ساتھ سلام خوانی ثابت کرنے کے لئے بھی انہی بے قاعدگیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

نمبر۸:... اس نمبر میں علامہ صاحب لکھتے ہیں:

’’قال ابوبكر الصديق رضي الله عنه: من انفق

درھمًا علٰی قرائة مولد النبی صلی اللہ علیه وسلم کان رفیقی فی الجنة۔ ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: جس (مسلمان) نے ایک درہم حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کے میلاد پڑھنے پر خرچ کیا، وہ بہشت میں میرا رفیق ہوگا۔''

(نظریاتِ صحابہ ص:۲۲)

نمبر۹:...''**وقال عمر رضی اللہ عنه: من عظم مولد النبی صلی اللہ علیه وسلم فقد احیا الاسلام۔** ترجمہ: حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: جس نے حضور (اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کا میلاد عظمت اور تعظیم سے منایا تو اس نے اسلام کو زندہ کیا۔'' (نظریاتِ صحابہ ص:۲۲)

نمبر۱۰:...''**وقال عثمان رضی اللہ عنه: من انفق درھمًا علٰی قراءة مولد النبی صلی اللہ علیه وسلم فکانّما شھد بدر وحنین۔** ترجمہ: حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: جس (ایماندار) نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے میلاد شریف پڑھانے پر ایک درہم خرچ کیا گویا وہ جنگِ بدر اور حنین میں حاضر ہوا۔'' (نظریاتِ صحابہ ص:۲۳)

نمبر۱۱:...''**وقال علی رضی اللہ عنه وکرّم اللہ وجھه: من عظّم مولد النبی صلی اللہ علیه وسلم وکان سببًا لقراءَتهٖ لا یخرج من الدنیا اِلّا بالایمان ویدخل الجنة بغیر حساب۔** ترجمہ: حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: جس نے میلادِ مصطفیٰ کی تعظیم کی اور میلاد پڑھانے کا سبب بنا، اُس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اور وہ بلاحساب بہشت میں جائے

گا۔" (نظریاتِ صحابہ ص:۲۳)

"لہٰذا جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد کی محافل سے چڑتے ہیں اور میلاد کے جلسے اور جلوس منعقد نہیں کرتے، بلکہ ناجائز وحرام قرار دیتے ہیں، تو وہ خلفائے اربعہ اور اہلِ مدینہ صحابہ کے منکر اور گستاخ ہیں۔" (نظریاتِ صحابہ ص:۲۴)

الجواب باسم ملہم الصواب:

مذکورہ بالا چاروں نمبروں میں علامہ صاحب نے جشنِ میلاد کے بڑے لمبے چوڑے فضائل بیان کئے ہیں...سبحان اللہ...بارہ ربیع الاوّل کے جشنِ میلاد میں شریک ہوکر آدمی اسلام کو زندہ کرلیتا ہے، بدر وحنین کے شہدأ کا مقام حاصل کرلیتا ہے، اور بغیر حساب وکتاب کے جنت میں چلا جاتا ہے، واہ...! واہ...!

افسوس! کہ اصحابِ رسولؐ کو یہ فضائل معلوم نہ ہوسکے، ورنہ انہیں دینِ اسلام کی سربلندی کے لئے نہ جہاد کرنا پڑتا اور نہ ہی بدر و اُحد اور حنین جانا پڑتا، بس بارہ ربیع الاوّل کو جشن مناتے، اسلام زندہ ہوجاتا اور بدر و اُحد و حنین کے شہدأ کا مقام حاصل ہوجاتا، اور جنت کا داخلہ بغیر حساب کے مل جاتا۔

علامہ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ مذکورہ بالا تینوں روایتیں بے سند، بے اصل، اور بے بنیاد ہیں، اگر علامہ صاحب میں ہمت ہے تو ان کی اسناد بیان فرمائیں اور رُواۃ کی ثقاہت بیان فرمائیں، اور منہ مانگا انعام حاصل کریں، کیونکہ اسناد دینِ اسلام کا حصہ ہیں، اور بے سند بات کبھی حجت نہیں بن سکتی، چنانچہ علامہ عبدالعزیز صاحب پرہاروی فرماتے ہیں:

"قال محمد بن الحاتم: ان اللّٰہ اکرم ھٰذہ الأمۃ بالاسناد ولیس لأحد من الامم اسناد."

ترجمہ:... ’’امام محمد بن الحاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:
اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو اسناد کے ساتھ عزت بخشی ہے، اُممِ سابقہ کو اسناد کی دولت نصیب نہیں ہوئی، اسناد اس امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے۔‘‘

”وقال سفيان الثوری: الاسناد سلاح المؤمن.“

ترجمہ:... ’’امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:
اسناد مؤمن کا ہتھیار ہے۔ (جس کے پاس ہتھیار نہیں ہے وہ کس کے ساتھ لڑے گا؟)۔‘‘

”وقال الشافعی رحمه الله: مثل الذی يطلب الحديث بلا اسناد مثل حاطب ليل يحملُ حربة حطب فيها افعیٰ تلدغهٗ وهو لا يدری.“

ترجمہ:... ’’امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: جو شخص بلا اسناد حدیث طلب کرتا ہے وہ ایسے ہے جیسے رات کو لکڑیاں جمع کرنے والا وہ لکڑیوں کی گٹھڑی اُٹھاتا ہے، نامعلوم اس میں سانپ ہوتا ہے، وہ اس کو ڈس لیتا ہے اور اس کو علم بھی نہیں ہوتا۔‘‘

”وقال عبدالله بن المبارک رحمه الله: الاسناد من الدين، ولو لا الاسناد لقال من شاء ما شاء.“

ترجمہ:... ’’حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اسناد دین کا حصہ ہے، اور اگر اسناد نہ ہوتیں تو جس کی مرضی جو چاہتا کہتا۔‘‘

”وقال الفقيه ابو نصر بن سلام رحمه الله: ليس شيء اثقل على اهل الالحاد ولا ابغض اليهم من رواية الحديث بالاسناد.“

ترجمہ:... ”فقیہ ابو نصر بن سلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: بے دین لوگوں پر حدیث کی اسناد سب سے زیادہ بھاری ہیں، اور ان کو اسنادِ حدیث سب سے زیادہ ناپسند ہیں۔“

(کوثر النبی ج:۱ ص:۳،۴)

علامہ صاحب! آپ نے ان روایتوں کی سند کیوں نہیں بیان کی؟ کیا بے سند باتیں نقل کرنا جائز ہے؟ کیا سند آپ پر بھاری تو نہیں؟ آپ کو سند سے نفرت تو نہیں؟ سند تو دین کا حصہ ہے، جس کو آپ نے چھوڑ دیا، سند چھوڑ کر آپ حاطب اللیل کیوں بن گئے؟ کیا بے سند اور بے بنیاد باتوں سے کوئی مسئلہ یا عقیدہ یا کوئی نظریہ ثابت ہوتا ہے؟ من گھڑت اور جھوٹی روایتوں سے ”نظریاتِ صحابہ“ کیسے ثابت ہوں گے؟ تعجب کی بات ہے کہ آپ نے بریلویوں کے خیالات کے مجموعہ کا نام ”نظریاتِ صحابہ“ رکھ دیا...! علامہ صاحب! آپ اپنے رسالہ کا نام نظریاتِ بریلویہ، رضویہ، کاظمیہ، اویسیہ، فیضیہ، رکھیں یہی نام آپ کے رسالہ کے مناسب ہیں، اور جھوٹ بھی نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے، یہ نظریاتِ صحابہ نہیں ہیں، صحابہ کرامؓ کے نفوسِ قدسیہ ان غلط نظریات سے پاک اور صاف ہیں۔

علامہ صاحب کا سہارا:

علامہ صاحب جانتے ہیں کہ یہ تینوں روایتیں بے سند اور بے بنیاد ہیں، لیکن اپنے سر سے بلا ٹالنے کے لئے امام ابنِ حجر مکیؒ کی کتاب ”نعمتِ کبریٰ“ کا حوالہ دے کر سہارا حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اپنے حواریوں کے لئے طفل تسلی کا سامان

مہیا کیا، لیکن لاحاصل! کیونکہ ابنِ حجر مکیؒ کا سہارا اتنا کھوکھلا ہے کہ وہ خود علامہ صاحب کو بھی لے ڈوبے گا۔

کیونکہ ابنِ حجر مکیؒ نے اپنی کتاب ''نعمتِ کبریٰ'' میں نہ تو ان روایات کی سند بیان کی ہے، اور نہ ہی کسی کتاب کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ ابنِ حجر مکیؒ اور خلفائے راشدینؓ کے درمیان تقریباً ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے، کیونکہ ابنِ حجر مکیؒ دسویں صدی کا آدمی ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ روایات ان تک کن ذرائع سے پہنچیں؟ درمیان میں کون سے راوی ہیں؟ اور وہ کیسے ہیں؟ وغیرہ، اور لطف یہ ہے کہ ابنِ حجر مکیؒ پھر کسی کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیتے، لہٰذا جب تک اسناد اور حالاتِ رُواۃ اور مأخذِ حدیث معلوم نہ ہوں حدیث کبھی بھی حجت اور دلیل نہیں بن سکتی، لیکن بنے یا نہ بنے! علامہ صاحب نے خواہ مخواہ ان کو میلادخوانی کی دلیل بنادیا۔

مروّجہ میلادخوانی کی ابتدا کب ہوئی؟

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کا تذکرہ ایک ایسا مستحسن عمل ہے جس سے ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہر مؤمن کے لئے بہت بڑی خوشی کا مقام ہے، بشرطیکہ ان تذکروں اور خوشیوں میں اپنی طرف سے قیودات نہ لگائی جائیں اور خانہ زاد تخصیصات بھی نہ کی جائیں، اور اس مطلق عبادت میں غیرشرعی اُمور کو شامل کرکے اس کی خاص شکل و صورت اور ہیئت وضع نہ کی جائے، کیونکہ اگر ثابت شدہ عبادت میں اپنی طرف سے قیود لگائی جائیں اور تخصیصات ملائی جائیں اور اس کی ایک نئی شکل و ہیئت وضع کی جائے تو وہ عبادت، عبادت نہیں رہتی، بلکہ بدعت کی حد میں داخل ہوجاتی ہے، یہی سب کچھ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے تذکروں اور خوشیوں میں کیا گیا ہے، مثلاً:

۱:... میلاد پڑھانے اور میلاد کی خوشی منانے کے لئے ۱۲ربیع الاوّل کی تاریخ مقرر کی گئی ہے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے حالات بیان کرنے کے لئے شرعاً نہ کوئی مہینہ مقرر کیا گیا اور نہ کوئی تاریخ مقرر کی گئی، بلکہ جب چاہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا تذکرہ کرو، بلکہ ہر روز اور ہر وقت کرو، لیکن اپنی طرف سے تاریخ و ماہ کا تعین مت کرو۔

۲:... میلاد خوانی کے لئے ایک خاص قسم کی محفل منعقد کی جاتی ہے، مخصوص انداز سے اس کی بناوٹ وسجاوٹ کی جاتی ہے، اس میں چراغاں کا اہتمام ہوتا ہے، اور جھنڈوں اور جھنڈیوں کا انتظام ہوتا ہے، اور اس میں ایک خاص بیٹھک بنائی جاتی ہے اور یہ تصوّر کیا جاتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں، اور اس بیٹھک پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، اور مجلسِ میلاد کی محفل میں ان سب اُمور کو ضروری اور عبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی چیز بھی عبادت کی قسم سے نہیں ہے۔

۳:... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے تذکرہ کے وقت سب حاضرین کا کھڑے ہوجانا اور قیام کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کا اجتماعی طور پر پڑھنا، حالانکہ محفلِ میلاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف کا عقیدہ خود غلط ہے، کتاب وسنت کی کسی دلیل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حاضر و ناظر ہونا سرے سے ثابت ہی نہیں، پھر اپنے لئے قیام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں کیا، بلکہ صحابہ کرامؓ چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قیام کیا کریں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو قیام کرنے سے منع فرمادیا۔

۴:... خاص قسم کا جلوس نکالا جاتا ہے، جس میں بہت سے غیرشرعی اُمور کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اور خاص قسم کی نعرہ بازی کی جاتی ہے، بعض علاقوں میں سڑکوں اور چوکوں پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی شبیہ تیار کی جاتی ہے،

جس طرح شیعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ کی شبیہ تازیہ کی شکل میں بناتے ہیں، اور پھر اس شبیہ کے اردگرد سلام خوانی کی جاتی ہے، حالانکہ اس جلوس اور اس میں ہونے والی خرافات کا ثبوت نہ کتاب اللہ سے ملتا ہے، اور نہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، اور نہ ہی خیرالقرون سے اس کا ثبوت دستیاب ہوتا ہے۔

۵:... اسی مقررہ تاریخ میں ایصالِ ثواب کی خیرات کا اہتمام کرنا اور قسم قسم کے مأکولات و مشروبات کا انتظام کرنا، حالانکہ شرعاً ایصالِ ثواب کی خیرات کے لئے کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے۔

۶:... پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس کا نام ''عید'' رکھا گیا ہے، حالانکہ اسلام میں عیدیں تو دو ہیں: عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ، اس تیسری ''عید'' کا ثبوت نہ قرآن سے ملتا ہے اور نہ حدیث سے، خیرالقرون میں ۱۲/ربیع الاوّل کے دن کو ''عید'' کا دن نہیں کہا گیا، بلکہ اس کو ''عید'' کہنا ایجادِ بندہ ہے، بعض لوگ اس کو ''جشنِ عید میلاد'' بھی کہتے ہیں، حالانکہ اس قسم کا جشن منانا غیرمسلم قوموں کا وطیرہ ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کو یہ لوگ میلاد خوانی کا جزو سمجھتے ہیں، لیکن ہم انہی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

پس حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کا مطلق تذکرہ ایک محبوب عمل ہے، اور اس کے مستحسن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، تمام علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم اس کے قائل ہیں اور اس پر ان کا عمل بھی ہے، تحقیق کے لئے فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، وغیرہ کتب کا مطالعہ ضروری ہے۔ حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ کی ایک خاص تصنیف اس موضوع پر ''نشر الطیب فی ذکر الحبیب'' کے نام سے مشہور اور معروف ہے۔ اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ علمائے حق کی بیسیوں کتابیں اور ہزاروں تقریریں اس موضوع پر موجود ہیں، لیکن اپنی طرف سے اس میں قیودات اور تخصیصات کی ملاوٹ کرنا اور اس کی ایک

خاص ہیئت ایجاد کرنا ایک ایسا ناجائز اقدام ہے، جس کی وجہ سے مروّجہ میلادخوانی بدعت کی حد میں داخل ہوجاتی ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اور مقدس تذکروں میں خرافات کی ملاوٹ کرکے ان کو بدعات سے آلودہ کرنے والوں کی طرف سے ہمیشہ یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، بلکہ عشق ہے، اور محبت وعشق میں مغلوب ہوکر ہم آپؐ کے میلاد کی خوشی مناتے ہیں، عشق ومحبت کی منزلیں شریعت سے ماوراء ہیں، لہٰذا ہم جس انداز سے بھی خوشی منائیں ہمارے لئے جائز ہے، کون ہے ہمارے ساتھ شریعت کی باتیں کرنے والا؟ ہم تو عاشقِ رسول ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں محبت کی وجہ سے کرتے ہیں، لیکن محبت کی بھی حدود ہیں اور اس کا دائرہ ہے، دائرۂ محبت سے باہر نکلنا اور حدودِ محبت کو پھلانگنا منع ہے، محبت میں حد سے بڑھ جانا غلو فی الدین ہے، جس سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ شیعہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ماتم میں جو کچھ کرتے ہیں، وہ بھی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں، لیکن غلو کرتے ہیں اور حد سے بڑھ جاتے ہیں، اسی طرح یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو ''ابن اللہ''، اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' کہتے ہیں، وہ بھی محبت کی وجہ سے کہتے ہیں، لیکن حدودِ محبت توڑ کر غلو کا شکار ہوجاتے ہیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچی محبت تھی، اپنے بیوی بچوں سے، بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت تھی، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کی خوشی بھی ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود ان حضرات نے اس خاص طریقہ اور انداز سے خوشی نہیں منائی، ۱۲ر ربیع الاوّل کی محفل انہوں نے منعقد نہیں کی، قیام انہوں نے نہیں کیا، جلوس انہوں نے نہیں نکالا، اس دن خیراتیں ان سے ثابت نہیں، حالانکہ محبت اور

خوشی ان کے دلوں میں بدرجہ اتم موجود تھی، پس باوجود اسباب ومحرکات کے انہوں نے یہ کام نہیں کیۓ اور یقیناً نہیں کیۓ، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اُمور کو دین نہیں سمجھتے تھے، اگر مروّجہ میلادخوانی بمع اپنے لوازمات کے دین وعبادت ہوتی تو صحابہ کرامؓ یقیناً ہم سے اس میں سبقت لے جاتے، کیونکہ ان کو عبادات کا شوق تھا، نیکیاں کمانے کی حرص تھی، لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے ۱۲/ربیع الاوّل کو جلوس نہیں نکالا، میلادخوانی اورنعرہ بازی نہیں کی، محفلِ میلاد منعقد کر کے قیام نہیں کیا، سلام خوانی نہیں کی، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کاموں کو دین اور عبادت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ خیرالقرون میں ان کاموں کا نام ونشان تک نہیں تھا، حالانکہ خیرالقرون میں جس کام کو دین سمجھ کر کیا گیا وہ دین ہے، اور خیرالقرون میں جس کام کو دین نہیں سمجھا گیا وہ دین نہیں بن سکتا، کیونکہ خیرالقرون میں جس کام کو باوجود محرکات ودواعی کے دین نہیں سمجھا گیا، اور بعد والے لوگوں کا اُس کو دین بنالینا بدعت ہے، البتہ اُمورِ دنیا کی نئ ایجادات اس سے خارج ہیں، اور تعلیم دین اور تبلیغ اسلام کے ذرائع اور وسائل بھی اس سے خارج ہیں، کیونکہ یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہیں۔

قارئینِ کرام! تاریخ شاہد ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر چھ سو سال تک کہیں بھی مسلمانوں میں ۱۲/ربیع الاوّل کو اس طرز کی خوشی نہیں منائی گئی، اور نہ ہی کہیں خوشی کا یہ نرالا انداز اپنایا گیا، پورے چھ سو سال تک ہر سال ۱۲/ربیع الاوّل کی تاریخ آتی رہی، لیکن اس میں محفلِ میلاد منعقد نہیں کی جاتی تھی، اور نہ ہی اس میں مأکولات ومشروبات کا انتظام کیا جاتا تھا، اور نہ ہی جلوس نکالے جاتے تھے۔ الغرض مروّجہ میلادخوانی کے نام سے آج جو کچھ ہو رہا ہے، اسلام کی پوری چھ صدیوں میں ان کاموں میں سے کوئی کام بھی نہیں ہوا، البتہ ۶۰۴ھ میں موصل شہر میں ایک بادشاہ کے حکم سے اس بدعت کو ایجاد اور جاری کیا گیا، اور اُسی دور کے ایک دنیاپرست مولوی نے محفلِ میلاد کے جواز پر مواد اکٹھا کر کے کتاب بنادی اور اُس

بادشاہ سے انعام حاصل کیا۔ اس بدعت کو جاری کرنے والے بادشاہ کا نام مظفرالدین بن اربل کوکری بتایا جاتا ہے، اور دربار سے انعام پانے والے مولوی صاحب کا نام عمر بن دحیہ ابوالخطاب المتوفی ۶۳۳ھ تھا، تفصیلات کے لئے ''دُول الاسلام'' اور ''القول المعتمد فی عمل المولد'' کا مطالعہ کریں۔

مظفرالدین کوکری اور عمر بن دحیہ کون ہیں؟

مظفرالدین کوکری اور عمر بن دحیہ، اوّل الذکر بادشاہ سلامت میلادخوانی کے موجد اور بانی ہیں، اور ثانی الذکر مولوی صاحب انعام کی لالچ میں بادشاہ سلامت کے مؤید ہیں، خیر سے دونوں صاحبان ساتویں صدی کے لوگ ہیں، لہٰذا مروّجہ میلادخوانی کی ابتدائی تاریخ بھی معلوم ہوگئی کہ یہ بدعت ساتویں صدی میں ایجاد ہوئی۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ دونوں، موجد اور مؤید کس حیثیت اور مقام کے مالک ہیں؟ تو گزارش ہے کہ ان دونوں صاحبان کی حیثیت اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے آپ کتبِ تاریخ اور کتبِ رجال کا مطالعہ کریں، البتہ ہم یہاں پر اتنی گزارش کرتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات غیرمقلد ذہنیت رکھتے تھے، اور ان کا مزاج بھی غیرمقلدین والا تھا، چنانچہ احمد بن محمد مصری لکھتے ہیں:

''کان ملکًا مسرفًا یأمر علماء زمانہٖ أن یعملوا باستنباطھم واجتھادھم، وأن لا یتبعوا لمذھب غیرھم.'' (القول المعتمد فی عمل المولد)

ترجمہ:... ''مظفر الدین کوکری ایک مسرف بادشاہ تھا، وہ اپنے زمانہ کے علمأ کو کہا کرتا تھا کہ: وہ اپنے استنباط اور اجتہاد پر عمل کریں، اور غیر کے مذہب کی پیروی نہ کریں۔''

دیکھ لیا آپ نے! کہ بادشاہ سلامت اپنے دور کے علمأ کو یہ سبق دے رہے

ہیں کہ کسی کے مذہب کی پیروی نہ کرو، یعنی ائمہ مجتہدین کی تقلید نہ کرو، بلکہ براہِ راست کتاب وسنت میں اجتہاد کرو اور خود مسائل کا استنباط کرو اور اس پر عمل کرو۔

قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ ائمہ دین سے لوگوں کو بدظن کرنا اور ان کی پیروی سے روکنا اور یہ ذہن سازی کرنا کہ قرآن و حدیث سے خود مسائل معلوم کرو، اگرچہ اہلیت نہ بھی ہو، اور ہر کہ و مہ کو مفتی اور مجتہد بنانا کس کا کام ہے؟ ہر منصف مزاج آدمی جانتا ہے کہ یہ غیرمقلدین کا کام ہے اور یہ گندی ذہنیت انہی کی ہے، پس معلوم ہوا کہ مروّجہ میلادخوانی کا موجد مظفرالدین کوکری غیرمقلد تھا، اور اسی طرح سب سے پہلے مروّجہ میلادخوانی پر کتاب لکھنے والا مولوی عمر بن دحیہ بھی خیر سے غیرمقلد تھا، چنانچہ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”کثیر الوقیعة فی الائمة وفی السلف من العلماء خبیث اللسان احمق، شدید الکبر، قلیل النظر فی امور الدین متهاونًا.“ (لسان المیزان ج:۴ ص:۲۱۶)

ترجمہ:... ”وہ ائمہ دین اور علماً سلف صالحین کی شان میں بہت ہی گستاخی کیا کرتا تھا، اور گندی زبان کا مالک تھا، بڑا احمق اور متکبر تھا، دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور سست تھا۔“

آپ خود سوچیں ائمہ دین کا گلہ شکوہ کون کرتے ہیں؟ اور علمائے سلف صالحین کو کون برا بھلا کہتے ہیں؟ گندی زبان کن کی ہے؟ احمق اور متکبر کون ہیں؟ ہر دانشمند سمجھتا ہے کہ یہ سارے اوصاف غیرمقلدین ہی کے ہیں، تو معلوم ہوا کہ میلادخوانی کے جواز پر مواد اکٹھا کرنے والا مولوی صاحب بھی غیرمقلد تھا۔

جس مسئلہ کے بانی ایسے لوگ ہیں خود قیاس کرلیں کہ وہ مسئلہ کیسا ہوگا...؟

قیاس کن زگلستان من بہار مرا!

چتروڑیوں، مودودیوں اور بریلویوں کا مشترکہ طرزِ عمل:

یہ تینوں گروپ اگرچہ مسلکِ حقہ اہلِ سنت والجماعت سے بہت سے مسائل میں کٹ چکے ہیں، لیکن پھر بھی اپنے آپ کو اہلِ سنت والجماعت سے منسلک سمجھتے ہیں۔

مثلاً: اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام بعد از وفات اپنی اپنی قبور میں بہ تعلقِ رُوح مع الجسد العنصری زندہ ہیں، اور زائرین کا سلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں، لیکن چتروڑی اس حیات اور سماع کا انکار کرکے اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہو چکے ہیں۔

اسی طرح اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ حق ہیں اور تنقید و تنقیص سے بالاتر ہیں، لیکن مودودیوں کے نزدیک صحابہ کرامؓ نہ تو معیارِ حق ہیں اور نہ ہی کہ وہ نہ کی تنقید سے بالاتر ہیں، پس مودودی حضرات بھی مقامِ صحابہؓ سے انکار کرکے اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہو چکے ہیں۔

اسی طرح اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک عالم الغیب صرف اللہ ہے، اور کائنات کے سارے اختیارات کا مالک بھی صرف اللہ ہے، اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، لیکن بریلوی حضرات، اللہ تعالیٰ کی یہ تینوں صفات انبیاؑ کرامؑ و اولیاؑ عظامؒ میں ثابت کرکے اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہو چکے ہیں۔

اور یہ تینوں گروپ اپنے عقائد اور مسائلِ مخصوصہ کو جب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو فہمِ سلف صالحین کو بالائے طاق رکھ کر اور اہلِ سنت والجماعت کے راستہ کو چھوڑ کر براہِ راست قرآن و حدیث سے دلیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جو کہ خالصتاً غیر مقلدین کا وطیرہ ہے، اس کے برعکس اہلِ سنت والجماعت اگرچہ اپنا مستدل قرآن و حدیث کو سمجھتے ہیں، لیکن یہ لوگ قرآن و حدیث کی وہی تشریح و تفسیر

معتبر سمجھتے ہیں جو کہ سلف صالحین کے فہم کے مطابق ہو نہ کہ مخالف، اور یہی کچھ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کا مطلب ہے۔

پس یہ تینوں جماعتیں اپنے مسائلِ مخصوصہ ثابت کرتے وقت جب فہمِ سلف صالحین کو نظرانداز کردیتے ہیں اور اکابر کے راستے کو چھوڑ دیتے ہیں اور براہِ راست قرآن و حدیث سے دلیل بناتے ہیں تو مشترکہ طور پر غیر مقلدیت سے جاملتے ہیں، میں ان تینوں حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ اگر آپ اہلِ سنت والجماعت کو سچی جماعت سمجھتے ہو، اس کو طائفۂ ناجیہ جانتے ہو، تو اس جماعت کے تمام مسائل اور عقائد کو تسلیم کرو اور اپنے اپنے تفردات چھوڑ دو، اور اگر تم اپنے تفردات نہیں چھوڑ سکتے، بلکہ اپنے تفردات کو حق اور اہلِ سنت والجماعت کو ناحق سمجھتے ہو، تو پھر اہلِ سنت والجماعت چھوڑ کر اپنی کوئی اور جماعت بنالو، تاکہ کسی کو دھوکا نہ لگے۔

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگا ہوجا
سراسر موم ہو یا سنگ ہوجا!

آمدم برسر مطلب:

ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے درمیان میں یہ جملہ معترضہ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا، لیکن میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میلادخوانی کو ساتویں صدی کے اوائل میں ایجاد کرنے والا ایک غیر مقلد بادشاہ اور اس کی تائید کرنے والا ایک غیر مقلد مولوی تھا، اور ترکِ تقلید کے نتائج ہمیشہ اس قسم کی صورتوں میں رونما ہوتے رہتے ہیں، جب تاریخی طور پر یہ بات مسلّمہ حقیقت ہے کہ یہ میلادخوانی ساتویں صدی کی پیداوار ہے تو اس کے بدعت ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ اُسی دور سے لے کر آج تک ہر دور کے علمائے حقہ نے اس کو بدعت ہی کہا ہے، البتہ جمہور علماً نے اس کو بدعت کہہ کر ردّ کردیا ہے، اور بعض دوسرے علماً نے اس کو بدعتِ حسنہ کہہ

کر گوارا کرلیا ہے، لیکن کہا سب نے بدعت ہی ہے، کسی دور میں کسی عالم نے اس کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کی سنت قرار نہیں دیا۔

چنانچہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”ھٰذا وان لم یرد فیہ نص ففیہ القیاس.“

(الحاوی للفتاویٰ ج:۱ ص:۱۹۶)

ترجمہ:... ”میلاد خوانی کے اثبات میں کوئی نص موجود نہیں ہے، بلکہ قیاس آرائی ہے۔“

لطف کی بات یہ ہے کہ علامہ صاحب نے جس رسالہ ”نعمتِ کبریٰ“ سے خلفائے راشدینؓ کی طرف منسوب کردہ چار روایتیں میلاد کے فضائل میں نقل کی ہیں، اس رسالہ کے ساتھ ایک اور رسالہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کا چھپا ہوا ہے، اور اس میں صفحہ:۶ پر یہ لکھا ہے:

”قد سئل شیخ الاسلام حافظ العصر ابو الفضل ابن حجر عن عمل المولد، فأجاب بما نصہ عمل المولد بدعۃ لم ینقل عن أحد من السلف الصالح من القرون الثلاثۃ.“

ترجمہ:... ”شیخ الاسلام حافظ العصر ابوالفضل ابن حجرؒ سے میلاد کے عمل کے متعلق سوال کیا گیا، تو انہوں نے ان لفظوں میں جواب دیا کہ: میلاد کا عمل بدعت ہے، خیرالقرون کے سلف صالحین سے اس کا کوئی ثبوت منقول نہیں ہے۔“

اگر مروّجہ میلاد خوانی خلفائے راشدینؓ سے ثابت ہوتی تو اس کو بدعت نہ کہا جاتا، بلکہ اس کو سنت کہا جاتا، کیونکہ حدیث میں مروی ہے: ”علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین!“ پس معلوم ہوا کہ خلفائے راشدینؓ سے مروّجہ میلاد خوانی کے

فضائل ہرگز ثابت نہیں ہیں، علامہ صاحب نے دیدہ و دانستہ خلفائے راشدینؓ پر بہتان باندھا ہے: سُبۡحَانَکَ ھٰذَا بُھۡتَانٌ عَظِیۡمٌ! اُولٰـئِکَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا یَقُوۡلُوۡنَ!

خیرالقرون کے لوگ اور علامہ صاحب کا فتویٰ:

علامہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''لہٰذا جو لوگ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد کی محافل سے چڑتے ہیں اور میلاد کے جلسہ اور جلوس منعقد نہیں کرتے، بلکہ ناجائز اور حرام قرار دیتے ہیں، تو وہ خلفائے اربعہ اور اہلِ مدینہ صحابہؓ کے منکر اور گستاخ ہیں۔''
>
> (نظریاتِ صحابہ ص:۲۴)

علامہ صاحب کے فتویٰ کو غور سے پڑھئے! کیا فرمارہے ہیں؟ فرماتے ہیں کہ: میلاد کے جلسہ اور جلوس منعقد نہ کرنے والا خلفائے اربعہ اور اہلِ مدینہ صحابہؓ کے منکر اور گستاخ ہیں، اور ہم نے ابھی ابھی علامہ صاحب کی محبوبہ، مطلوبہ اور پسندیدہ کتاب ''نعمتِ کبریٰ'' کے ساتھ چھپے ہوئے رسالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ خیرالقرون کے سلف صالحین میلاد کا جلسہ اور جلوس منعقد نہیں کرتے تھے اور اُن سے میلاد والا عمل منقول نہیں ہے، لہٰذا بدعت ہے، اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، بتائیں کہ فتویٰ کے ساتھ علامہ صاحب کی محبوبہ کتاب کا حوالہ ملادیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ خلفائے اربعہؓ، صحابہ کرامؓ اور تمام خیرالقرون کے لوگ، خلفائے اربعہؓ اور اہلِ مدینہ صحابہؓ کے گستاخ اور منکر ہیں... العیاذ باللہ... و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا... ایسے فتوؤں اور مفتیوں سے خدا کی پناہ...!

ہمارے بریلوی بھائی بادشاہ ہیں:

آپ نے دیکھ لیا کہ اذان کے ساتھ مروّجہ سلام خوانی آٹھویں صدی ہجری

میں ایک بادشاہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے ایجاد کی، اور مروّجہ میلاد خوانی ساتویں صدی ہجری میں ایک بادشاہ مظفرالدین کوکری نے ایجاد کی، یہ دونوں مسئلے بادشاہوں کی ایجاد ہیں، ہمارے بریلوی بھائی بھی بادشاہ ہیں کہ بادشاہوں کی ایجاد کو مذہب اور دین بنالیا، حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ دین بادشاہوں کا نہیں ہے، دین اللہ کا ہے، اور اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے والے ہیں، بادشاہوں کو دین بنانے کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن بادشاہ تھے! کون اُن سے پوچھ سکتا تھا کہ کامل اور مکمل دین میں کیوں نئی چیزیں شامل کر رہے ہو؟ اور ادھر ہمارے بریلوی بھائی بھی بادشاہ ہیں، ان سے بھی کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ خیرالقرون والے دین کو چھوڑ کر کیوں بادشاہوں کے ایجاد کردہ دین کو اپنا رہے ہو؟ لیکن بادشاہ فقیروں کی کب سنتے ہیں...؟

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت:

جب ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں میلاد خوانی کی رسم کو ایجاد کیا گیا تو اس وقت یہ عمل نہایت مختصر شکل میں تھا، اس میں زیادہ طول وطوال نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اُس دور کے علماً نے اس کو بدعت کہا، اگرچہ بعض نے بدعت کے ساتھ ''حسنہ'' کا بھی اضافہ کیا، چنانچہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ملحقہ ''نعمتِ کبریٰ'' میں لکھا ہے:

> ''ان عمل المولد الذی هو اجتماع الناس وقراءة ما تيسر من القرآن ورواية الأخبار الواردة فی مبدأ امر النبی صلی اللہ علیه وسلم وما وقع من مولدہ من الأيات ثم يمد لهم سما؟؟ يأكلونهٗ وينصرفون من غير زيادة علٰی ذالک من البدع الحسنة.''

(رسالہ سیوطی ملحقہ ''نعمتِ کبریٰ'' ص:۳)

ترجمہ:... ’’عملِ میلاد میں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور قرأتِ قرآن ہوتی ہے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے متعلق روایاتِ حدیث پڑھی جاتی ہیں اور ولادتِ باسعادت کے وقت جن آیات کا ظہورا ہوا ان کو بیان کیا جاتا ہے، اور پھر دسترخوان بچھا کر لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، پھر لوگ واپس چلے جاتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔‘‘

اسی مختصر سے عملِ میلاد کو امام سیوطیؒ بدعتِ حسنہ کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا! یہ ہے امام جلال الدین سیوطیؒ کے دور کا عملِ میلاد اس میں نہ قیام کا ذکر ہے، اور نہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا نظریہ ہے، اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص بیٹھک بنانے کا ذکر ہے، اور نہ جلوس کا ذکر ہے، اور نہ ہی جلوس میں ہونے والے غیر شرعی اُمور کا تذکرہ، اور نہ ہی ناقۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکالنے کا حکم ہے، اور نہ ہی روضۂ رسول کی شبیہ کا ذکر اور نہ اس کے اردگرد سلام خوانی کا تذکرہ ہے، وغیرہ، وغیرہ، یہ سب اضافہ جات بعد کے لوگوں نے کئے ہیں اور مزید اضافہ جات کی بھی توقع ہے، ’’عید میلاد النبی‘‘ اور ’’جشنِ میلاد‘‘ تک تو پہنچ چکے ہیں، نامعلوم آگے کہاں تک پہنچیں گے؟ کیونکہ حدود تو دین کی ہوتی ہیں اور یہ تو احداث فی الدین ہے، لہٰذا اس کی کوئی حد نہیں ہے، جتنا مرضی چاہے بڑھاتے جائیں، لیکن جو سنی ہوگا وہ تو سنت پر عمل کرے گا، بدعت چاہے کیسی حسین و جمیل ہو اور خوبصورت اور رنگین ہو پھر بھی بدعت ہے، کوئی سنی خوبصورت بدعت پر عمل کرکے ’’حسین بدعتی‘‘ بننے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہے۔ میرے خیال میں محفلِ میلاد کو بدعتِ حسنہ کہنے والے حضرات اگر آج موجود ہوتے اور مروّجہ میلاد خوانی کو دیکھتے تو وہ بھی اس کو بدعتِ سیئہ کہتے، کیونکہ اب تو پانی سر سے اُوپر نکل چکا ہے۔

پھر وہی بے اُصولیاں:

مروّجہ میلادخوانی کو دومنٹ کے لئے اگر بدعتِ حسنہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو پھر فقہائے کرامؒ کے مسلّمہ اُصولوں کے تحت اس پر عمل کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس پر عمل کرنے سے فقہائے کرامؒ کے وہ سب اُصول ٹوٹ جاتے ہیں جو کہ بعد الجنازہ دُعاخوانی اور بعد الاذان سلام خوانی ثابت کرنے میں ٹوٹ چکے ہیں، مثلاً:

اگر کوئی کام فی نفسہٖ مباح بلکہ مستحب ہے، لیکن لوگ اس کو ضروری سمجھتے ہیں تو اس کو ترک کردینا چاہیئے، دیکھو فتاویٰ عالمگیریہ جلد:۱ صفحہ:۱۳۶، فتاویٰ شامی جلد:۱ صفحہ:۵۷۷۔

میلادخوانی کو بریلوی حضرات فرض سے بالا فرض سمجھتے ہیں، اس کو اپنے دین کے شعائر سے جانتے ہیں، اور جو لوگ اس میلادخوانی میں شامل نہ ہوں ان کو ملامت کرتے ہیں، بلکہ فتوے لگاکر ان کو ابلیس سے ملادیتے ہیں، لہٰذا جب ایک بدعتِ حسنہ کو فرض سے بھی بڑھا دیا جائے تو فقہائے کرامؒ کے نزدیک اس پر عمل کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔

اسی طرح اگر کوئی کام سنت اور بدعت میں دائر ہو تو اس کو بھی ترک کردینا چاہیئے، دیکھو فتاویٰ شامی جلد:۱ ص:۴۷۵، اور مروّجہ میلادخوانی سنت اور بدعت میں دائر نہیں ہے، بلکہ یہ بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ میں دائر ہے، لہٰذا اس کو بطریقِ اَوْلیٰ ترک کردینا ضروری ہے۔

اسی طرح فقہائے کرامؒ کے نزدیک مطلق عبادت کی کسی وقت کے ساتھ اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں ہے، لیکن بریلوی حضرات محفلِ میلاد کی ۱۲ ربیع الاوّل کے ساتھ تخصیص کرکے اُصول کو توڑ ڈالتے ہیں۔

اسی طرح عباداتِ مطلقہ کی ایک خاص شکل و ہیئت اپنی طرف سے وضع کرنا

جائز نہیں ہے، لیکن یہاں بھی بریلوی حضرات نے ''جشنِ میلاد'' کی خاص ہیئت وضع کر کے مسلّمہ اُصول کو توڑ دیا ہے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر اپنے عقیدہ کو بیان کرتے ہیں کہ: نفسِ ذکرِ ولادت ایک ایسا مستحسن عمل ہے جس سے ہر کلمہ گو مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے، لیکن اس میں اپنی طرف سے قیودات لگا کر ایک نئی ہیئت وشکل وضع کر لینا بدعت ہے۔

علامہ صاحب کو دعوتِ غور وفکر:

علامہ صاحب! غور فرمائیں اور ٹھنڈے دِل سے سوچیں کہ جب خلفائے راشدینؓ نے میلاد خوانی کے اتنے بڑے فضائل بتائے ہیں، تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ خلفائے راشدینؓ نے ۱۲ربیع الاوّل میں محافلِ میلاد منعقد کیوں نہیں کیں؟ عید میلاد النبی کیوں نہیں منائی؟ جشن کیوں نہیں منایا؟ جلوس کیوں نہیں نکالا؟ خیراتیں کیوں نہیں کیں؟ میلاد خوانی کا اتنا بڑا ثواب کیوں نہ کمایا؟ علامہ صاحب! سوچ سمجھ کر جواب دیں...!

نمبر۱۲:... علامہ صاحب اس نمبر میں لکھتے ہیں:

''حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت، توسل، وسیلہ اور میلاد کے بارے میں صحابیٔ رسول اور عمِ رسول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اعتقاد۔

اخرج الحاکم والطبرانی عن خریم بن اوس قال: ھاجرت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصرفہٗ من تبوک فسمعت العباس یقول: یا رسول اللہ! انی اُرید ان امتدحک. قال: قُلْ لا یفضض اللہ فاک۔ تو حضرت عباسؓ نے یہ اشعار پڑھے:

من قبلها طبت في الظلال وفي

مستودع حيث يخصف الورق

ثم هبطت البلاد لا بشر

أنت ولا مضغة ولا علق

بل نطفة تركب السفين وقد

ألجم نسرًا وأهله الغرق

تنقل من صالب الی رحم

اذا مضى عالم بدا طبق

وبردت نار الخليل مستترًا

في صلبه أنت كيف يحترق

حتّٰى احتوى بيتك المهيمن من

خندف علياء تحتها النطق

وأنت لما ولدت أشرقت

الأرض وضاءت بنورك الأفق

فنحن في ذالك الضياء وفي

النور وسبل الرشاد نخترق

ترجمہ: زمین پر آنے سے پہلے آپ جنت کے سائے میں خوشحال تھے، اور نیز ودیعت گاہ میں جہاں (جنت کے درختوں کے) پتے اُوپر جوڑے جاتے تھے (یعنی آپ صلبِ آدم علیہ السلام میں تھے اور ودیعت گاہ سے مراد صلب ہے، جیسا کہ اس آیت میں مفسرین نے کہا "مستقر ومستودع") اس کے بعد آپ نے بلاد (یعنی زمین) کی طرف نزول فرمایا، اور آپ اس

وقت نہ بشر تھے اور مضغہ اور نہ علق، بلکہ (صلبِ آباء میں) محض ایک مادّۂ مائیہ تھے کہ وہ کشتیٔ نوح میں سوار تھا اور حالت یہ تھی کہ نسر بت اور اس کے ماننے والوں کے لبوں تک طوفان پہنچ رہا تھا، وہ مادّہ (اسی طرح واسطہ در واسطہ) ایک صلب سے دوسرے رحم تک نقل ہوتا رہا، جب ایک طرح کا عالم گزر جاتا، دوسرا طبقہ ظاہر ہوجاتا، یعنی یہ مادّہ سلسلۂ آباء کے مختلف طبقات میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ اسی سلسلہ میں آپ نے نارِ خلیل میں بھی وُرُود فرمایا، چونکہ آپ ان کی صلب میں مختفی تھے تو وہ کیسے جلتے؟ یہاں تک آپ کا خاندانی شرف جو کہ آپ کی فضیلت پر شاہد ظاہر ہے اولاد خندف (آپ کے جد بعید مدرکہ بن الیاس کی ماں کا لقب ہے) میں سے ذروۂ عالیہ پر جاگزین ہوا، جس کے تحت میں حلقے (یعنی دوسرے خاندان مثل درمیانی حلقوں کے) تھے، اور آپ جب پیدا ہوئے تو زمین روشن ہوگئی اور آپ کے نور سے آفاق منوّر ہوگئے، سو ہم اس ضیأ اور اس نور میں ہدایت کے راستوں کو قطع کر رہے ہیں۔

اب جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت اور وسیلہ اور میلاد بیان کرنے کے منکر ہیں وہ حضرت عباس صحابیٔ رسول اور عمِ رسول کے منکر اور گستاخ ہیں۔'' (نظریاتِ صحابہ ص:۲۴ تا ۲۷)

الجواب باسم ملہم الصواب:

علامہ صاحب نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مدحیہ اشعار تو ''الخصائص الکبریٰ'' للسیوطی جلد:۱ صفحہ:۳۹ کے حوالے سے نقل کئے ہیں اور ان کا اُردو ترجمہ حکیم

الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی ''نشر الطیب فی ذکر الحبیب'' سے نقل فرمایا، اور پھر ان اشعار سے تین مسئلے ثابت کئے: مسئلہ میلاد، مسئلہ وسیلہ اور مسئلہ نور۔ اب بالترتیب ان تینوں مسائل کی وضاحت آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔

۱:... مسئلہ میلاد:

میلاد کے متعلق گزشتہ اوراق میں وضاحت ہوچکی ہے کہ نفسِ ذکرِ ولادتِ باسعادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مؤمن کے ایمان کو تازہ کرنے والا مقدس عمل ہے، علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم اس کے قائل ہیں اور اس پر ان کا عمل بھی ہے اور تصانیف بھی ہیں، اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدأ آفرینش کے حالات بیان کئے، لیکن اس سے مروّجہ میلادخوانی تو قطعاً ثابت نہیں ہوتی۔ علامہ صاحب کی مذہبی برادری ''عید میلاد النبی'' اور ''محفلِ میلاد'' اور ''جشنِ میلاد'' کے نام سے جو کارنامے سرانجام دیتی ہے ان کا تو ان اشعار میں نام ونشان تک بھی نہیں ہے، نہ محفلِ میلاد کے انعقاد کا ذکر ہے، اور نہ ہی جلسہ وجلوس کا تذکرہ ہے، اور نہ ہی قیام کا ذکر ہے، اور نہ سلام خوانی کا اور نہ ہی مأکولات کا تذکرہ اور نہ مشروبات کا، اس طرز کی میلادخوانی تو ساتویں صدی ہجری کی ایجاد ہے، اسی لئے تو مجوزین حضرات بھی اس کو بدعتِ حسنہ کہہ کر اس کی گنجائش نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، صحابہؓ اور تابعینؒ کے مبارک دور میں تو اس شکل وصورت کی میلادخوانی نہیں ہوتی تھی، خیرالقرون کے لوگ تو اس طرز کی خوشی منانے کو جانتے بھی نہ تھے، لہٰذا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مدحیہ اشعار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کا تذکرہ ہے اور اس پر ہر مؤمن کا ایمان ہے، اور یہی حقیقی خوشی ہے، مروّجہ میلادخوانی سے ان اشعار کا کوئی تعلق

نہیں ہے، اگر علامہ صاحب خواہ مخواہ ان اشعار کو اپنی مروّجہ میلاد خوانی کے لئے دلیل بناتے ہیں تو ہم مجبوراً اتنا عرض کریں گے:

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے!

۲:... مسئلہ توسل و وسیلہ:

الحمدللہ! علمائے اہلِ سنت والجماعت دیوبند کثر اللہ جماعتہم، انبیأ، اولیأ اور صلحأ کے وسیلہ کے قائل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ...." (المائدہ: ۳۵)

یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرو، مفسرینِ کرامؒ نے لکھا ہے کہ جو چیز رغبت و محبت کے ساتھ بندے کو معبودِ حقیقی کے قریب کردے وہ وسیلہ ہے، اس لئے سلف صالحین صحابہؓ و تابعینؒ نے اس آیت میں وسیلہ کی تفسیر طاعت و قربت اور ایمان و عملِ صالح سے کی ہے، پس اس آیت کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرو بذریعہ ایمان اور عملِ صالح کے، جس طرح ایمان اور عملِ صالح اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں، اسی طرح انبیأ و صلحأ کے ساتھ محبت کرنا اور عقیدت رکھنا بھی اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، بلکہ انبیأ کے ساتھ محبت کرنا ایمان میں داخل ہے، اور صلحأ سے محبت کرنا عملِ صالح میں داخل ہے، کیونکہ جو شخص اپنے ربّ کے حضور نبی یا ولی کا وسیلہ پیش کرتا ہے، اس کی حقیقی بنیاد نبی و ولی کی محبت و عقیدت ہے جو اس کے دِل میں موجود ہے، اور وہ شخص اسی محبت و عقیدت کی وجہ سے ان کا وسیلہ پیش کر رہا ہے، لہٰذا انبیأ و صلحأ کا وسیلہ درحقیقت ایمان و عملِ صالح کے وسیلہ کی ایک صورت ہے، اور ایمان اور عملِ صالح کے توسل میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، کیونکہ یہ وسیلہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیثِ بخاری سے بھی، جس میں تین غار والوں کا قصہ

بیان کیا گیا ہے کہ وہ غار میں پھنس گئے، نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ انہوں نے اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کا وسیلہ پیش کر کے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی اور غار سے نکلنے کی راہ حاصل کی۔ نیز "وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا" (البقرہ:۸۹) کی تفسیر میں "رُوح المعانی" میں لکھا ہے کہ: اہلِ کتاب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلے سے دُعا مانگا کرتے تھے، آیت کی یہ تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے، نیز جامع ترمذی کی ایک صحیح حدیث جو کہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، توسل کی دلیل ہے، کیونکہ ایک نابینا آدمی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور دُعا کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک دُعا سکھائی جس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"اللّٰھم انی اسئلک واتوجه الیک بنبیک محمد نبی الرحمة."

یعنی اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کے نبیٔ رحمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے توسل جائز ہے۔ یہ روایت ترمذی شریف جلد:۲ صفحہ:۱۹۷ پر موجود ہے۔ صحاحِ ستہ کی یہ حدیث: "ھل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم!" بھی توسل کی دلیل ہے کیونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: تمہیں رزق اور فتح ونصرت تمہارے ضعیفوں اور کمزوروں کی وجہ سے دی جاتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ کمزور اور ضعیف ہمارے رزق اور فتح کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ توسل کے مزید دلائل بھی ہمارے موجود ہیں لیکن ہم انہیں دلائل پر اکتفا کرتے ہیں۔

خدا معلوم! علامہ صاحب ہمارے علمائے دیوبند کو انکارِ توسل کا طعنہ کیوں

دے رہے ہیں؟ حالانکہ علامہ صاحب کے امام احمد رضا خان صاحب بریلوی نے آج سے کچھ عرصہ پہلے علمائے دیوبند کی کتب سے قطع و برید کر کے اور چند غلط نظریات ان کی طرف منسوب کر کے علمائے حرمین شریفین کو دھوکا دیا اور علمائے حقہ کے خلاف فتاویٰ جات حاصل کئے، اور ہندوستان آکر ''حسام الحرمین'' کے نام سے ان کو شائع کر کے علمائے حقہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی، لیکن جب حرمین شریفین کے علماؑ کو امام احمد رضا خان صاحب کی دھوکا دہی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے فتاویٰ جات سے رجوع کرلیا اور حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لئے انہوں نے ایک سوالنامہ مرتب کر کے علمائے دیوبند کی طرف بھیجا تاکہ صحیح صورتِ حال معلوم ہوجائے، چنانچہ علمائے دیوبند نے مشورہ کر کے جوابات لکھنے کے لئے محدثِ کبیر شارحِ ابی داؤد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ کا نامِ نامی منتخب کیا، مولانا موصوف نے ایک ایک سوال کا جواب لکھا اور اس وقت کے تمام علماؑ نے اس کو پڑھا اور تصدیقی دستخط کئے، اور علمائے حرمین شریفین کو یہ جواب نامہ ارسال کردیا گیا، وہاں کے علماؑ نے تصدیق کردی کہ علمائے دیوبند درحقیقت اہلِ سنت والجماعت کے ترجمان ہیں اور انہوں نے اقرار کیا کہ ہمیں دھوکا دے کر یہ فتویٰ حاصل کیا گیا ہے، اب جبکہ حقیقتِ حال واضح ہوچکی ہے تو ہمارا ''حسام الحرمین'' کے فتووں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ اس جواب نامہ کو بمع تصدیقات علمائے حجازِ مقدس ومصروشام ''المهند علی المفند'' یعنی عقائدِ علمائے دیوبند کے نام سے شائع کیا گیا، علمائے حرمین شریفین کے سوالات میں سے تیسرا اور چوتھا سوال حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے توسل کے متعلق تھا، جس کا جواب علمائے حق نے یہ دیا کہ:

> ''ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک دعاؤں میں انبیاؑ علیہم السلام و اولیاؑ وصدیقین کا توسل جائز ہے، ان کی حیات میں یا بعد وفات بایں طور کہے کہ: ''یا اللہ میں

بوسیلہ فلاں بزرگ کے تجھ سے دُعا کی قبولیت اور حاجت برائی چاہتا ہوں'' اس جیسے اور کلمات کہے، چنانچہ اس کی تصریح فرمائی ہے ہمارے شیخ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی ثم المکیؒ نے، پھر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کو بیان فرمایا ہے، جو چھپا ہوا آج کل لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے، اور یہ مسئلہ اس کی پہلی جلد کے صفحہ:۹۳ پر مذکور ہے، جس کا جی چاہے دیکھ لے۔'' (المہند ص:۱۲، ۱۳)

الغرض! ہمارے تمام علمائے دیوبند و مشائخِ دیوبند توسل کے قائل ہیں، ان کی کتابیں اور فتاویٰ اس پر شاہدِ عدل ہیں۔ علامہ صاحب بھی بخوبی جانتے ہیں کہ علمائے دیوبند توسل کے قائل ہیں، لیکن عادت سے مجبور ہیں، اس لئے انکارِ توسل کا الزام علمائے حق پر لگا کر اپنے امام احمد رضا خان صاحب بریلوی کی سنت ادا کردی۔

بہرحال توسل انبیاؑ و اولیاؒ برحق ہے، لیکن اس کے متعلق دو چیزیں ذہن نشین کرلیں:

۱:... انبیاؑ و اولیاؒ کے توسل سے دُعا مانگنا جائز ہے، فرض، واجب اور لازمی نہیں، جو شخص بغیر توسل کے اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہے تو اس پر کسی قسم کا اعتراض نہ کرنا چاہئے، کیونکہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے شریعت کے مطابق کر رہا ہے، کیونکہ انبیاؑ کرامؑ اور صحابہ کرامؓ کی دُعائیں اکثر توسل کے بغیر ہیں، لہٰذا توسل کو ضروری سمجھنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ توسل کے بغیر کوئی دُعا قبول نہیں ہوتی، ایک غلط نظریہ اور غلط عقیدہ ہے، بس بات اتنی ہے کہ کسی کے توسل سے مانگا جائے تو شرعاً یہ بھی جائز اور ثابت ہے، اور اگر بغیر توسل کے مانگا جائے تو شرعاً یہ بھی جائز اور ثابت ہے، دونوں طریقوں سے دُعا مانگنا دُرست ہے، کسی کو کسی پر طعن بازی اور فتویٰ بازی جائز نہیں ہے، جب دونوں طریقوں سے دُعا مانگنا جائز ہے تو ایک طریقہ سے مانگنے والے کو دوسرے طریقے والوں پر ناک بھوں نہیں چڑھانی چاہئے، بلکہ شریعت کی دی ہوئی ہر

گنجائش کو گوارا کرلینا ضروری ہے، غلو کرنا منع ہے۔

۲:... دوسری بات ذہن نشین کرنے کے قابل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیاروں کا وسیلہ دے کر مانگنے والوں کا یہ عقیدہ نہ ہونا چاہئے کہ توسل والی دُعا اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتے ہیں اور صاحبِ وسیلہ اللہ تعالیٰ سے زبردستی منوالیں گے، یہ عقیدہ رکھنا خود غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اس پر کوئی جبر نہیں کرسکتا، اور نہ کسی کی ہستی ہے کہ اس سے زبردستی منوالیں، یہ تو مانگنے والا اللہ کے پیاروں کو اپنا وسیلہ بنا کر مانگ رہا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ خود انہی پیاروں کی بات نہ مانے تو کوئی اُس سے پوچھنے والا نہیں ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا کے ایمان کی کوشش کرتے رہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر کے لئے استغفار کرتے رہے، اور حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کو بچانے کے لئے دُعا کرتے رہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر کی کوشش کے باوجود آپؐ کے چچاجان کو ایمان نصیب نہیں ہوا، حضرت نوح علیہ السلام دُعا مانگتے رہے لیکن بیٹا غرق ہوگیا، خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باپ کے استغفار سے روک دیا گیا، بہرحال وسیلہ دے کر مانگنے والا یہ عقیدہ رکھ کر مانگے کہ اگر باوجود وسیلہ کے بھی وہ دُعا رَدّ کردے تو کوئی اُس سے پوچھنے والا نہیں ہے: ”لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ!“

علامہ صاحب غور فرمائیں!

علامہ صاحب ایک طرف تو توسل کو ثابت کر رہے ہیں اور علمائے دیوبند پر انکارِ توسل کا الزام دے کر فتویٰ بازی بھی کر رہے ہیں، اور دوسری طرف انبیاءؑ و اولیاءؒ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مختارِ کل ہیں، جو چاہیں کریں، اللہ تعالیٰ نے کائنات کے سارے اختیارات اپنے پیاروں میں تقسیم کردیئے ہیں، وہ جس کو چاہیں دیں اور

جس کو چاہیں نہ دیں، کائنات کے ذرّہ ذرّہ کے یہ مالک ہیں، ہر چیز کے نفع ونقصان کے مالک بھی یہی ہیں، حالانکہ یہ دونوں عقیدے ایک ساتھ نہیں چل سکتے، کیونکہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے پیارے صرف وسیلہ ہیں، دینے والا مالک اللہ تعالیٰ آپ ہے، تو یہ مختارِکل نہیں ہیں، بلکہ وسیلہ ہیں، اور اگر یہ اختیارات کے مالک ہیں تو وسیلہ دینے کا کیا مطلب؟ بہرحال علامہ صاحب فکر کریں اور سوچیں کہ وسیلہ اور مختارِکل کیسے جمع ہوسکتے ہیں؟ الحمدللہ! علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم توصحیح توسل کے قائل ہیں، لیکن اگر علامہ صاحب نے مختارِکل کے عقیدہ کو نہ چھوڑا تو توسل کا خودبخود انکار لازم آئے گا:

میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا!

۳:...نورانیت:

علامہ صاحب نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اشعار سے تیسرا مسئلہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کا بیان کیا، لیکن علامہ صاحب اور ان کی مذہبی برادری کو معلوم ہونا چاہئے کہ ...الحمدللہ... ثم الحمدللہ... علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کے قائل ہیں، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور بلکہ نور علیٰ نور، اور انور الانوار سمجھتے ہیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبعِ نور اور مصدرِ نور سمجھتے ہیں اور آپ کو حضور پُرنور کہتے ہیں، ہمارے علماً تو حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے آل واصحاب کو بھی نور سمجھتے ہیں، اسی لئے تو ہمارے علماً حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو ''ذوالنورین''، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''ذی النور'' کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں صحابی دامادِ رسول ہیں، لیکن حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نور کے جز ہیں یا اللہ تعالیٰ کے نور میں سے ہیں، نہیں! نہیں! بالکل نہیں! اللہ تعالیٰ بے مثل بے مثال ہے، اور ''لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ'' اس کی صفت ہے، اور ''لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ'' اس کی شان ہے، حضورِ

پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم تو نورِ ہدایت ہیں جیسا کہ قرآن مجید کو بھی نورِ ہدایت کہا گیا ہے، کیونکہ نور کی تعریف علماً نے یہ لکھی ہے: "الظاهر بنفسه والمظهر لغيره" یعنی نور وہ ہے جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو بھی ظاہر کرنے والا ہو، حضورِ پُرنور اور آپ کے آل واصحاب کو نورِ ہدایت اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خود بھی ہدایت پر ہیں اور دوسروں کو ہدایت کی راہ دکھانے والے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں جس طرح لوگ چاند، سورج اور ستاروں کے نور سے کسبِ فیض کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل واصحاب سے بھی لوگ ہدایت کا فیض حاصل کرتے ہیں، بلکہ پوری دنیا میں ان حضرات کا نورِ ہدایت پھیلا ہوا ہے، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ومطہر بشریت کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، بلکہ سیّد البشر ہیں، آپ انسان ہیں اور اولادِ آدم میں سے ہیں، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور جنس بشر ہے اور نور آپ کی صفت ہے، بہرحال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ہدایت ہیں اور یقیناً نورِ ہدایت ہیں، لیکن آپ کی پاک بشریت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے، کیونکہ علمائے اہلِ سنت والجماعت نے لکھا ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے انکار سے آدمی کا ایمان خطرہ میں پڑجاتا ہے، تفصیل کے لئے "رُوح المعانی" کا مطالعہ کریں۔

علامہ صاحب نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کو ایسے طریقہ سے بیان کیا کہ عام پڑھنے والے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ بشریت کے انکار کا تأثر حاصل ہوتا ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ مسئلۂ بشریتِ انبیاً کرامؑ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اُجاگر کیا جائے۔

بشریتِ انبیاؑ کرامؑ:

چونکہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر انسان آباد ہیں، اسی لئے ان کی ہدایت و راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی بھی انسانوں کی جنس سے بھیجے ہیں، اور مناسبت بھی اسی میں ہے کہ ایک جنس کی اصلاح کے لئے ان کا ہم جنس ہی موزوں اور مناسب ہے، کیونکہ "الجنس یمیل الٰی جنسہٖ" یعنی ہم جنسوں کا آپس میں میلان اور جوڑ ہوتا ہے، کسی شاعر نے خوب کہا:

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر، باز با باز!

مشرکین مکہ بار بار یہ سوال کرتے تھے کہ ہماری طرف فرشتے کو نبی بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو ہم ان کی ہدایت کے لئے بھی فرشتے رسول بنا کر بھیجتے، لیکن جب زمین میں انسان آباد ہیں تو انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے انسان ہی مناسب ہے۔ تفصیل کے لئے سورۂ بنی اسرائیل آیت: ۹۳ تا ۹۵ کا مطالعہ ضروری ہے۔

کلام اللہ شریف کی آیاتِ کثیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی، انسان، بشر اور آدمی ہوتے ہیں، لیکن ہم صرف چند آیات پر اکتفا کرتے ہیں۔

ا:... "قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا، تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ. قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ." (ابراہیم: ۱۰، ۱۱)

ترجمہ:... "انہوں (کفار) نے (رسولوں سے) کہا کہ: تم محض بشر ہو جیسے ہم ہیں، تم یوں چاہتے ہو کہ ہمارے آباء

واجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے اس سے ہم کو روک دو، سو کوئی صاف معجزہ دکھلاؤ۔ ان کے رسولوں نے کہا کہ: ہم بھی تمہارے جیسے بشر ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں احسان فرماتے ہیں۔“

فائدہ:... کفار سمجھتے تھے کہ نبوّت اور بشریت ایک دوسرے کے منافی ہیں، یعنی بشر نبی نہیں بن سکتا، اسی لئے اللہ کے رسولوں کو یہ طعنہ دیا کہ تم تو ہماری طرح بشر ہو، لہٰذا تم نبی نہیں بن سکتے۔ اللہ کے نبیوں کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ واقعی ہم تمہاری طرح بشر ہیں اور بشر ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے، اور نہ ہی بشریت اور نبوّت میں کسی قسم کی تنافی پائی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں احسان فرماکر نبوّت عطا فرماتے ہیں، پس ثابت ہوا کہ اللہ کے نبی بشر ہوتے ہیں، خود قرآنِ کریم میں نبیوں کا اقرار موجود ہے کہ ہم تمہاری طرح بشر ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں نبوّت عطا فرماکر ہم پر احسان کیا ہے۔

اسی آیت کے تحت ”کنزالایمان“ کے حاشیہ پر مفتی نعیم الدین مرادآبادی لکھتے ہیں: ”اچھا یہی مانو کہ ہم واقعی انسان ہیں۔“ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی واقعی انسان، بشر ہوتے ہیں۔

۲:... ”مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ.“ (آل عمران:۷۹)

ترجمہ:... ”کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوّت عطا فرماویں، پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر لیکن کہے گا کہ اللہ والے بن جاؤ۔“

فائدہ:... اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بشر کو کتاب، حکمت اور نبوّت عطا فرماتے ہیں۔

انبیاؑ کرامؑ آدمی ہوتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر آدمی اور مرد ہوتے ہیں، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ." (النحل:۴۳)

ترجمہ:... "اور ہم نے آپ سے قبل صرف آدمی ہی رسول بنا کر بھیجے ہیں کہ اُن پر وحی بھیجا کرتے تھے، سو اگر تم کو علم نہیں ہے تو اہلِ علم سے پوچھ کر دیکھو۔"

فائدہ:... اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب نبی آدمی اور مرد ہوتے ہیں، یعنی کوئی غیر آدمی اور غیر مرد نبی نہیں ہوا، چنانچہ اسی آیت کے تحت مفتی نعیم الدین صاحب مرادآبادی "کنزالایمان" کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

"یہ آیت مشرکینِ مکہ کے جواب میں نازل ہوئی، جنہوں نے سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا اس طرح انکار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے برتر ہے کہ وہ کسی بشر کو رسول بنائے، انہیں بتایا گیا کہ سنتِ الٰہی اسی طرح جاری ہے، ہمیشہ اُس نے انسانوں میں سے مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔" (حاشیہ "کنزالایمان" کے تحت آیتِ مذکورہ)

ماشاءاللہ! مفتی صاحب نے واضح کردیا کہ نبی انسان، مرد اور بشر ہوتے ہیں اور یہی سنتِ الٰہی ہے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں:

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اعلان کیا گیا ہے، ان میں سے چند آیات آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔

۱:... "قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا." (بنی اسرائیل:۹۳)

ترجمہ:..."(اے پیغمبر!) آپ فرمادیجئے کہ سبحان میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں، پیغمبر ہوں اور کیا ہوں۔"

فائدہ:... مشرکینِ مکہ کا نظریہ تھا کہ کوئی بشر اللہ کا نبی و رسول نہیں بن سکتا، چنانچہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوّت فرمایا تو انہوں نے آپؐ کی بشریت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا انکار کردیا اور قسم قسم کے غلط مطالبات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کردیئے، اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو سرزمینِ مکہ کے پہاڑ ہٹ جائیں اور نہریں بہنے لگیں، کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگ آئیں یا آسمان کا ٹکڑا ہم پر ساقط ہوجائے یا ملائکہ ہمارے سامنے آکر آپ کی نبوّت کی شہادت دیں یا آپ کا گھر سونے کا ہونا چاہئے یا پھر آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں، لیکن صرف آسمان پر چڑھنا کافی نہیں، بلکہ وہاں سے ہماری طرف ایک خط لے کر آئیں اور ہم اس کو پڑھیں، تب ہم ایمان لائیں گے۔ ان سب مطالبات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیات:۹۰ تا ۹۳ نازل فرمائیں کہ تم نے جو اتنے سارے مطالبات مجھ سے کئے ہیں یہ سب کام میرے بس میں نہیں ہیں، ان کاموں کو کرنے والا تو میرا اللہ ہے، اور وہ اپنے کاموں میں وحدہٗ لا شریک ہے، میں تو بشر رسول ہوں، تمہارے مطالبات پورے کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، میں تو اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانے والا ہوں، تبلیغ کرنے والا ہوں، اور

دعوت الی اللہ دینے والا ہوں، میں صرف بشر رسول ہوں، خدا نہیں ہوں کہ تمہارے مطالبات پورے کرسکوں۔ پس ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقی بشر اور حقیقی رسول ہیں۔

۲:... ”قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ.“ (الکہف:۱۱۰)

ترجمہ:... ”(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں، میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔“

فائدہ:... اس آیت میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے آپ کی مقدس بشریت کا اعلان کیا گیا۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کے انسان ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن حکیم میں شان بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

۱:... ”لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ.“

(التوبۃ:۱۲۸)

ترجمہ:... ”تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق ومہربان ہیں۔“

فائدہ:... اس آیتِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم انسانوں کی جنس سے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ و اشرف درجہ کے عظیم انسان ہیں۔

۲:... "اَلرَّحْمٰنُ. عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ."

(الرحمٰن:۱ تا ۳)

ترجمہ:... "رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، اس نے انسان کو پیدا کیا۔"

"کنزالایمان" میں اس آیت کا ترجمہ یوں لکھا ہے:

"رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا، انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا۔"

مفتی نعیم الدین صاحب مرادآبادی "کنزالایمان" کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ:

"انسان سے اس آیت میں سیّدِ عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔"

فائدہ:... الحمدللہ! کہ "کنزالایمان" اور اُس کے حاشیہ سے ثابت ہوگیا کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں۔

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم رَجُل (آدمی) ہیں:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ."

(یونس:۲)

ترجمہ:... "کیا لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیجی۔"

"کنزالایمان" میں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

''کیا لوگوں کو اس کا اچنبھا ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک مرد کو وحی بھیجی۔''

فائدہ:...اس آیت میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''رَجُـل'' یعنی آدمی، مرد کہا گیا ہے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے عبد ہیں:

قرآنِ حکیم میں آیاتِ کثیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عبد'' یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ کہا گیا ہے، چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

۱:... ''وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا....'' (البقرۃ:۲۳)

۲:... ''سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ....'' (بنی اسرائیل:۱)

۳:... ''فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی.'' (النجم:۱۰)

۴:... ''تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ....'' (الفرقان:۱)

بلکہ ہر مسلمان کلمہ شہادت پڑھ کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کی شہادت دیتا ہے:

''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.''

بشریت النبیؐ کے متعلق نظریاتِ صحابہؓ:

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ذرا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس بشریت کے متعلق نظریاتِ صحابہ کرامؓ بھی معلوم کرلیں۔

۱:... ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انما انا بشر“ میں یقیناً بشر ہوں۔“ (مسند احمد، ابن ماجہ، بحوالہ جامع صغیر ج:۱ ص:۱۰۱)

۲:... ”اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بشر ہوں۔“

(مؤطا امام مالک، جامع صغیر ج:۱ ص:۱۰۱)

۳:... ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بشر ہوں۔“

(مسند احمد، مسلم شریف، جامع صغیر ج:۱ ص:۱۰۱)

۴:... ”حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بشر ہوں۔“

(مسلم شریف، نسائی، جامع صغیر ج:۱ ص:۱۰۱)

۵:... ”حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بشر ہوں۔“

(مسند احمد، ابن ماجہ، جامع صغیر ج:۱ ص:۱۰۱)

۶:... ”اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بشر ہوں۔“ (مسلم شریف ج:۲ ص:۳۲۳)

۷:... ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بشر ہوں۔“

(مسلم شریف ج:۲ ص:۳۲۴)

۸:... ”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بشر ہوں۔"

(مسلم شریف ج:۲ ص:۳۲۴)

۹:... "حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بشر ہوں۔"

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ شریف ص:۵۶۸)

قارئینِ کرام! آپ نے دیکھ لیا کہ صحابہ کرامؓ کا نظریہ یہ ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم افضل بشر، اشرف بشر اور سیّد البشر اور سیّد ولد آدم ہیں، لیکن خدا معلوم کہ علامہ صاحب نے بشریت النبیؐ کو نظریاتِ صحابہ میں کیوں شمار نہیں کیا؟ اگر علامہ صاحب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس و مطہر بشریت کا انکار کرتے ہیں، تو واضح فرمائیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ علامہ صاحب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرکے منکر و گستاخِ صحابہ ہیں، اور اگر علامہ صاحب صحابہ کرامؓ کے نظریہ کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر مانتے ہیں تو پھر یہ بتائیں کہ اس کو نظریاتِ صحابہ میں شمار کیوں نہیں کیا؟ علامہ صاحب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی پوزیشن واضح فرمائیں، سمجھ نہیں آتا کہ غلط نظریات کی نسبت تو صحابہ کرامؓ کی طرف کردی، لیکن جو صحیح نظریۂ صحابہ ہے اس کو چھوڑ دیا...!

بشریت النبیؐ کے متعلق امام احمد رضا خان صاحب کا نظریہ

علامہ صاحب کے پیشوا امام احمد رضا خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جسمِ اقدس جس خاکِ پاک سے بنا، صدیق و فاروق اسی مٹی سے بنے۔"

(السنیۃ الانیقہ فی فتاویٰ افریقہ ص:۸۵)

بشریت النبیؐ اور ''بہارِ شریعت''

''بہارِ شریعت'' کے مؤلف ابوالعلی حکیم امجد علی صاحب رضوی قادری، عقائد ے باب۔ یں لکھتے ہیں:

''عقیدہ: نبی اُس بشر کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لئے وحی بھیجی ہو۔

عقیدہ: انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جن نبی ہوا نہ عورت۔'' (بہارِ شریعت حصہ اوّل ص:۵)

''بہارِ شریعت'' امام احمد رضا خان صاحب کی مصدقہ کتاب ہے، اور اسی میں لکھا ہے کہ سب انبیاءؑ بشر تھے، اب علامہ صاحب بتائیں گے کہ ان کے پیشوا، و راہ نما سچ کہہ گئے ہیں یا جھوٹ؟ اگر سچ کہہ گئے ہیں تو علامہ صاحب اس کو ''نظریاتِ صحابہؓ'' میں شامل کریں، اور اگر جھوٹ بول گئے تو کم از کم اُن سے برأت کا اعلان تو کردیں...!

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں بشریت و انسانیت کے خواص ولوازمات

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے اندر انسانوں والے خواص و علامات اور لوازمات پائے جاتے تھے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسان، بشر، آدمی، مرد اور اولادِ آدم میں سے تھے، مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام ''عبداللہ'' ہے، دادا کا نام ''عبدالمطلب'' ہے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام سے ہوتا ہوا حضرت آدم علیہ السلام سے جاملتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا نام ''آمنہ بنت وہب'' ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماں کی طرف سے سلسلۂ نسب حضرت حوا علیہا السلام سے

جاملتا ہے، اسی حقیقت کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے مذکورہ بالا اشعار میں بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنے آباء کی اصلاب سے اور امہات کے ارحام سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہوئے دنیا میں تشریف لائے، اور اسی حالت کے متعلق حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: "ولا بشر انت ولا مضغة ولا علق" یعنی اس وقت اور اُس حالت میں آپ نہ بشر تھے، اور نہ مضغہ اور نہ علقہ، بلکہ آپ اپنے آباء کے اصلاب میں مادّۂ مائیہ تھے، یعنی مضغہ اور علقہ کے مراحل سے پہلے کی یہ بات ہے، اور جب آپ ان مراحل سے گزر کر دنیا میں تشریف لائے تو آپ کی ذات بابرکات کو انسان اور بشر بھی کہا گیا، آدمی، مرد اور اولادِ آدم بھی کہا گیا۔ اسی حقیقت کو خود علامہ صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے، کیونکہ "ولا بشر انت ولا مضغة ولا علق" ترجمہ یوں نقل کیا ہے کہ:

"آپ اُس وقت نہ بشر تھے اور نہ مضغہ اور نہ علق۔"

پس ثابت ہوا کہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے، بلکہ مضغہ اور علق کے مراحل سے بھی پہلے کی ہے، بہرحال ثابت ہوا کہ آپ حسب و نسب والے ہیں اور یہ سلسلۂ نسب دلالت کرتا ہے کہ آپ اولادِ آدم میں سے ہیں۔

اسی حقیقت کو "کنزالایمان" کے محشی صاحب نے تسلیم کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عربی قریشی جن کے حسب و نسب کو تم خوب جانتے ہو کہ تم سب سے عالی نسب ہیں۔" (حاشیہ "کنزالایمان" آیت: لقد جاءکم رسول من انفسکم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کے بطنِ مبارک سے آپؐ کی ولادتِ باسعادت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی حلیمہ اور چند دیگر عورتوں کا دُودھ پیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچپن کے مراحل سے گزرے، آپ نے بچپن میں بکریاں چرائیں، آپ بچوں سے کھیلے، آپ یتیم ہوئے، آپ کو بھوک و پیاس کا تقاضا ہوتا تھا،

اور آپ کھاتے اور پیتے تھے، آپ کو بیت الخلا جانے کی حاجت ہوتی تھی، اور آپ طہارت فرماتے تھے، آپ کو خوشی وغمی کے عوارضات لاحق ہوتے تھے، آپ سردی اور گرمی سے متاثر ہوتے تھے، آپ اُونٹ، گدھے، گھوڑے اور خچر کی سواری کرتے تھے، آپ کو پسینہ آتا تھا، اور آپ تھک بھی جاتے تھے، آپ کو نیند بھی آتی تھی، آپ کو مرض و درد کا عارضہ بھی لاحق ہوتا تھا، آپ کی داڑھی مبارک آپ کے سینے کو بھرنے والی تھی، آپ کی آخری عمر میں داڑھی کے چند بال سفید بھی ہوگئے، آپ کا دارِ فانی سے انتقال ہوا، آپ کو غسل دیا گیا اور کفن پہنایا گیا، آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، اور آپ کی قبر کھودی گئی، اور باقاعدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کیا گیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک جنت کے اعلیٰ ترین باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

''المہند علی المفند''، یعنی عقائدِ علمائے دیوبند میں لکھا ہے کہ: جس بقعہ مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، اس کی شان وعظمت کا مقابلہ بیت اللہ بھی نہیں کرسکتا اور عرشِ معلیٰ بھی نہیں کرسکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبرِ مبارک میں زندہ ہیں، صلوٰۃ وسلام پڑھنے والوں کا صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں، اور دُور سے جو دُرود شریف پڑھا جاتا ہے وہ فرشتوں کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاتا ہے، ستر ہزار فرشتے صبح وشام آپ کے مزارِ اطہر پر سلام پڑھتے ہیں۔

(سنن دارمی)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ گھر والیاں تھیں، آپ کی چار بیٹیاں ہیں اور تین یا چار باختلافِ روایات بیٹے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحبِ اولاد ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب جاری ہے، ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسان اور آدمی ہیں، کیا ہی خوب فرمایا مفتی نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے:

''کہ مجھ پر بشری اعراض و امراض طاری ہوتے

ہیں۔" (حاشیہ "کنزالایمان" تحت آیت: انما انا بشر مثلکم)

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اور شان ساری مخلوق سے اعلیٰ و ارفع ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو دوسرے انبیأ سے بھی اُونچی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو سیّد الانس والجن ہیں، بلکہ سیّد الانبیأ والمرسلین اور امام النبیین و خاتم النبیین ہیں، اور آپ سیّدِ ولد آدم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً نورِ ہدایت بھی ہیں اور سیّدالبشر بھی ہیں، ان میں سے کسی کا انکارنہیں کیا جاسکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ ہدایت ہونا بسر وچشم اور آپ کی مقدس بشریت بدِل و جان تسلیم، صلی اللہ علیہ وسلم۔

اکابرین علمائے دیوبند کی تعلیم یہ ہے کہ:

بعد از خدا بزرگ تو ای قصہ مختصر

نمبر۱۳:... علامہ صاحب اس نمبر میں لکھتے ہیں:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ محبوبانِ خدا سے توسل کے قائل تھے۔ اللھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا، قال فیسقون. رواہ البخاری ج:۱ ص:۱۳۷۔

ترجمہ: اے اللہ! ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی کا توسل کرتے تھے تو تو ہمیں بارش عطا فرماتا تھا، اور اب ہم اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ تیری بارگاہ میں پیش کرتے ہیں، ہمیں بارش دے، تو بارش سے سیراب کئے جاتے۔

اب جو لوگ محبوبانِ خدا کے وسیلہ کے قائل نہیں اور اس کو حرام و ناجائز کہتے ہیں وہ حضرت فاروقِ اعظمؓ اور صحابہ کے دشمن ہیں اور گستاخِ صحابہ ہیں، چونکہ کُنَّا جمع کا لفظ ہے۔"

(نظریاتِ صحابہ ص:۲۷، ۲۸)

الجواب باسم ملہم الصواب:

سابقہ جواب میں بندہ نے مسئلہ توسل کی وضاحت عرض کردی ہے کہ ہمارے اکابرین اہلِ سنت والجماعت علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم محبوبانِ خدا کے توسل اور وسیلہ کے قائل ہیں، لیکن وسیلہ سے دُعا مانگنا ضروری نہیں ہے، بلکہ جائز اور ثابت ہے، اللہ تعالیٰ سے بغیر وسیلہ کے بھی دُعا مانگنا جائز ہے اور ثابت ہے، پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وسیلہ والی دُعا ضروری قبول ہوگی، بلکہ عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، چاہے تو وسیلہ والی دُعا کو بھی قبول نہ فرمائے، کون اس سے پوچھ سکتا ہے؟ اس پر کوئی جبر کرنے والا نہیں ہے۔

البتہ ایک بات ملحوظِ خاطر رہے کہ علامہ صاحب نے بخاری شریف کی جو حدیث نقل کی ہے اس سے توسل کی ایک خاص صورت ثابت ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے تھے کہ یا رسول اللہ! آپ ہمارے لئے بارش وغیرہ کی دُعا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دُعا فرماتے اور صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا پر آمین کہتے تھے، اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عباسؓ سے توسل کیا تو اس کی بھی یہی صورت تھی کہ حضرت عباسؓ نے دُعا مانگی اور حضرت عمرؓ و دیگر صحابہ نے آمین کہی، توسل کی یہی صورت خیرالقرون میں عام رائج تھی، اور توسل کی اس خاص صورت میں کسی کو اختلاف نہیں، اس کے تو سب قائل ہیں، نامعلوم علامہ صاحب کے اس فتویٰ کی گولی کس کو لگے گی؟ جبکہ آگے کوئی نشانہ ہی نہیں ہے۔

نمبر۱۴:... اس نمبر میں علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعتقاد تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق کے سارے حالات جانتے تھے۔ یقول

(عمر) قام فينا النبي صلى الله عليه وسلم مقامًا فأخبرنا عن بدء الخلق حتّٰى دخل أهل الجنة منازلهم وأهل النار منازلهم۔ (رواہ البخاری ج:۱ ص:۴۵۳)

ترجمہ: حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم میں کھڑے ہوئے اور ہمیں ابتدأ مخلوق کے حالات کی خبر دینی شروع کی یہاں تک کہ بہشتی بہشت میں اپنے مقامات میں داخل ہوئے اور دوزخی دوزخ میں اپنے مقامات میں داخل ہوئے۔''

پھر علامہ صاحب نے حاشیہ اور شرح کا حوالہ دے کر یہ نتیجہ کشید کیا ہے کہ:

''اب جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق کے کسی ذرّہ سے بے علم اور بے خبر جانتے ہیں وہ فاروقِ اعظم کے دشمن اور گستاخ ہیں اور نظریۂ فاروقی کے منکر ہو کر بے دین ہیں۔''

(نظریاتِ صحابہ ص:۲۹،۳۰)

الجواب باسم ملہم الصواب:

علامہ صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت کردہ حدیث سے اپنا خودساختہ عقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرّہ ذرّہ کا علم تھا، آپ ساری مخلوق کے سارے حالات جانتے تھے، پھر ظلم بالائے ظلم یہ کہ یہ شرکیہ عقیدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر تھوپ دیا اور پھر اس عقیدہ کو ''نظریاتِ صحابہ'' میں شامل کر کے پوری اُمت کے مسلمانوں پر گستاخِ صحابہ اور منکرِ صحابہ کا فتویٰ جڑ دیا اور بے دین بھی کہہ دیا۔ حالانکہ علامہ صاحب اس حدیثِ بخاری کے مطلب کو کتاب و سنت کی روشنی میں معلوم کرنے کی کوشش کرتے اور سلف صالحین کے فہم کو

سامنے رکھ کر حدیثِ مذکورہ کی مراد معلوم کرتے تو یقیناً اتنا ظلم نہ کرتے جواب کر دیا۔

مصیبت یہ ہے کہ علامہ صاحب اپنے مخصوص نظریات ثابت کرنے کے لئے سلف صالحین کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں اور مجبوراً ان کو غیر مقلدین کے اسٹیج سے بات کرنی پڑتی ہے، اور غیر مقلدیت کا خیر سے اسٹیج ہی کچھ ایسا ہے جس میں سلف صالحین کا کوئی ادب و احترام نہیں ہے، اسی اسٹیج سے کتاب وسنت کے من مانے مطالب بیان کئے جاتے ہیں، اسی اسٹیج سے ائمہ مجتہدین پر کیچڑ اُچھالا جاتا ہے، اسی اسٹیج سے بے ڈھنگے فتوے جاری کئے جاتے ہیں، اسی اسٹیج سے صحابہ کرامؓ کو معیارِ حق سے گرایا جاتا ہے، اور اسی اسٹیج سے گندی زبان استعمال کی جاتی ہے، ''نمازِ حنفی'' جو درحقیقت ''نمازِ محمدی'' ہے، اسی اسٹیج سے اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، اور اسی اسٹیج پر ''فقہ حنفی'' جو درحقیقت ''فقہ محمدی'' ہے کو قرآن وحدیث کے خلاف ''سازش'' کہا جاتا ہے، چونکہ علامہ صاحب ایسے اسٹیج سے بول رہے ہیں، خیر سے بولی بھی انہی والی بولتے ہیں، جیسا دیس ویسا بھیس...!

قارئینِ کرام! اگر حدیثِ عمرؓ کا وہ مطلب لیا جائے جو علامہ صاحب نے بیان کیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات کے تمام حالات جانتے ہیں، بلکہ ذرّہ ذرّہ کا علم رکھتے ہیں تو یہ مطلب قرآن کے بھی خلاف، حدیث کے بھی خلاف، نظریاتِ صحابہ کے بھی خلاف، اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کے بھی خلاف اور فقہ حنفی کے بھی خلاف ہے۔

علامہ صاحب کا نظریہ قرآن کے خلاف ہے:

۱:...قرآن کہتا ہے کہ قیامت کی حتمی تاریخ کا علم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا گیا۔

۲:...قرآن کہتا ہے کہ شعر و شاعری کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں سکھایا گیا۔

۳:...قرآن کہتا ہے کہ بعض نبیوں کے حالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتائے گئے۔

۴:...قرآن کہتا ہے کہ بعض منافقین کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں تھا۔

۵:...قرآن میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اعلان کیا گیا ہے: "وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ" یعنی میں غیب نہیں جانتا۔

۶:...قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلواتا ہے: "ان ادری، لا ادری" یعنی میں نہیں جانتا۔

قارئینِ کرام! فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ قرآن تو کہتا ہے کہ آپ کو بعض چیزوں اور بعض شخصوں کا علم نہیں دیا گیا اور علامہ صاحب کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذرّہ ذرّہ کو جانتے تھے، یہ دو متضاد نظریات ہیں جس کو چاہیں سچا کہیں، اور جس کو چاہیں جھوٹا کہیں، لیکن انصاف شرط ہے...!

علامہ صاحب کا نظریہ حدیث کے بھی خلاف ہے:

ا:...بخاری شریف کی صحیح حدیث میں ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میدانِ محشر میں کچھ لوگ میرے حوضِ کوثر کی طرف آنے کی کوشش کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ملائکہ ان کو میرے حوضِ کوثر سے ہٹا کر جہنم کی طرف دھکیل دیں گے، تو میں کہوں گا کہ: یہ لوگ میرے ساتھی ہیں! لیکن مجھے جواب دیا جائے گا: "انک لا تدری ما أحدثوا بعدک!" یعنی آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا ایجاد کیا؟ یعنی اصلی دین کو چھوڑا اور نیا دین بنایا اور مرتد و مبتدع بن گئے۔ حضور فرمائیں گے کہ: جس نے میرے بعد دین کو تبدیل کیا اس کے لئے ہلاکت ہے۔ یہ حدیث بخاری شریف جلد:۲ صفحہ:۹۶۹ اور ص:۹۷۴ پر موجود ہے، اور بخاری شریف کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی یہ حدیث بکثرت

موجود ہے، اور تیس سے زیادہ اصحابِ کرامؓ اس کو روایت کرنے والے ہیں، اور وہ سب صحابہؓ یہی فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مرتدین کے حالات معلوم نہ تھے، اسی لئے آپ نے ان کو اپنا اُمتی سمجھا، حالانکہ وہ سچا دین چھوڑ کر مرتد ہوچکے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک طرف تیس سے زیادہ صحابہ کرامؓ ہیں جن کا نظریہ یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے سارے حالات کو نہیں جانتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتدین کے حال کا علم نہیں تھا، اور دوسری طرف ہمارے علامہ صاحب ہیں جو کہتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے سارے حال جانتے تھے اور یہی نظریۂ صحابہ ہے۔ فیصلہ خود فرمائیں کہ علامہ صاحب کے دعویٰ میں کتنے فیصد صداقت پائی جاتی ہے...!

علامہ صاحب کا صحابہ کرامؓ پر حملہ:

آپ نے بخاری اور دوسری کتبِ حدیث سے جان لیا کہ تیس سے زائد صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتدین کا حال معلوم نہیں تھا، اور علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ: جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق کے ایک ذرّہ سے بھی بے خبر جانے وہ بے دین ہے... معاذ اللہ... استغفر اللہ... علامہ صاحب ہوش میں آئیں...! آنکھیں کھولیں! کن لوگوں کو بے دین کہہ رہے ہیں...؟ آپ نے شاید یہ سمجھا کہ میرے فتویٰ کی گولی کا نشانہ صرف علمائے دیوبند ہیں، نہ! نہ! یہ تو اصحابِ رسول کا نظریہ اور عقیدہ ہے، اور آپ کے فتویٰ کا رُخ بھی اسی طرف ہے، لیکن آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے...!

۲:... بخاری شریف میں سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ: غزوۂ بنی المصطلق میں، میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھی، راستے میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا، وہاں میرا ہار گم ہوگیا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس

کی تلاش میں وہاں ٹھہر گئے اور لوگ بھی آپ کے ساتھ ٹھہر گئے، آپ نے ہار کی تلاش کے لئے آدمی بھیجے، جس مقام پر ہمارا پڑاؤ تھا وہاں پانی نہیں تھا، پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے لوگوں کو سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، اسی موقع پر تیمّم کی آیت نازل ہوئی، ہار نہ ملا، بالآخر روانگی کے لئے اُونٹ کو اُٹھایا گیا تو ہار اُونٹ کے نیچے پڑا ہوا تھا۔

(بخاری شریف ج:۱ ص:۴۸)

اس غزوہ میں سینکڑوں آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، اور سب کے سب آپ کے صحابہؓ تھے، سیّدہ عائشہ صدیقہ کا ہار گم ہوگیا، تلاش کیا گیا، آپ نے تلاش کے لئے خود آدمی بھیجے لیکن ہار نہ ملا، تلاش کرنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا، پانی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی اور پریشانی لاحق ہوئی، اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی آیت نازل فرمائی، لیکن ہار نہ ملا، بالآخر مایوس ہوگئے اور کوچ کے لئے اُونٹ کو اُٹھایا گیا تو گمشدہ ہار اُونٹ کے نیچے پڑا تھا۔ اب یہ تو خود علامہ صاحب بتائیں گے کہ گمشدہ ہار کی خبر نہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی اور نہ آپؐ کے صحابہ کو، اس کی کیا وجہ جبکہ آپ کے نزدیک حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو جانتے ہیں؟ پس ثابت ہوا کہ علامہ صاحب کا یہ نظریہ غلط اور احادیث کے مخالف ہے۔ غور کا مقام ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں شریک تمام صحابہ کرامؓ کا نظریہ تو یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہار کا علم نہیں تھا، اسی لئے صحابہ کرامؓ کو تلاش کرنے کا حکم دیا، لیکن علامہ صاحب کہتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کے ایک ذرّہ سے بے خبر ہیں تو وہ بے دین ہے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم! ملاحظہ فرمائیں ''نظریاتِ صحابہؓ'' کا مؤلف کس بے دردی سے نظریاتِ صحابہ کو بے دینی کہہ رہا ہے...!

۳:... بخاری شریف میں حدیثِ شفاعت موجود ہے، جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، اُس طویل حدیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

ہے کہ: میدانِ حشر میں لوگ تمام پیغمبروں سے واپس لوٹ کر میرے پاس شفاعت کے لئے آئیں گے تو میں فوراً شفاعت کے لئے سجدہ میں چلا جاؤں گا اور اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد و ثنا کروں گا جو اس وقت اللہ تعالیٰ میرے دِل میں الہام و القا کریں گے، پس میں انہیں تعریفوں سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کروں گا، جو اَب مجھے معلوم نہیں ہیں، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "**یلھمنی محامد أحمدہٗ بھا لا تحضرنی الأٰن**" یعنی وہ تعریفیں اُس وقت اللہ تعالیٰ مجھے سکھائیں گے، وہ اب مجھے معلوم نہیں ہیں۔

(بخاری شریف ج:۲ ص:۱۱۸)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کے بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا علم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو میدانِ محشر میں عطا کیا جائے گا، دنیا میں آپ کو ان کا علم نہیں دیا گیا۔ لیکن علامہ صاحب کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرّہ ذرّہ کا علم دے دیا گیا ہے، اور دھمکی بھی دے دی، اگر ایسا نہ مانو گے تو ...معاذ اللہ... بے دین ہو جاؤ گے۔

۴:... بخاری شریف میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے کہ: ایک غزوہ میں عبداللہ بن اُبیّ رئیس المنافقین نے اپنی خاص محفل میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے متعلق گستاخانہ باتیں کیں، حضرت زید بن ارقم کم عمر تھے انہوں نے ان کی باتیں سن لیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبیّ کو بلایا اور پوچھا کہ: کیا تو نے یہ باتیں کی ہیں؟ تو وہ قسم کھا کر کہنے لگا کہ: میں نے یہ باتیں نہیں کیں، یہ بچہ غلط کہتا ہے! تو حضرت زیدؓ فرماتے ہیں: "**فکذّبنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصدّقہٗ**" یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قسم پر اعتماد کرکے مجھے جھٹلایا اور اس کی تصدیق کردی۔ حضرت زیدؓ فرماتے ہیں: مجھے دکھ اور صدمہ پہنچا جس کی وجہ سے میں غم کے مارے گھر میں بیٹھ گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے سورۂ "**اذا جاءک المنافقون**" نازل

فرمائی، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے گھر سے بلایا اور یہ سورۃ سنائی پھر ارشاد فرمایا: "ان اللہ صدقک یا زید!" (اے زید! اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق کر دی ہے)۔ (بخاری شریف ج:۲ ص:۷۲۷)

علامہ صاحب ذرا اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر حضرت زید بن ارقم کی تکذیب کر دی تھی؟ نہیں...نہیں...نعوذ باللہ من ذالک... حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبیّ دنیاوی لحاظ سے ذی اثر اور عمر رسیدہ آدمی تھا، زبان کا طرار اور باتونی قسم کا عیار آدمی تھا، پھر اس نے قسم بھی اُٹھالی، مزید اس کی جماعت نے صفائی دے دی، ادھر حضرت زید کم عمر بچے تھے، ان کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں تھا، اکیلے تھے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی عالم الغیب نہیں تھے، انہیں حالات کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی باتوں اور قسموں پر اعتماد کر لیا اور حضرت زید کی تکذیب کر دی، لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقون نازل کر کے حقیقتِ حال کھول کر رکھ دی اور حضرت زید کی تصدیق بھی کر دی۔

ان مذکورہ بالا چار حدیثوں کے علاوہ اور دلائل بھی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو جاننے والا صرف اللہ ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ علوم عطا فرمائے ہیں جو آپ کے شایانِ شان تھے، مخلوق کے ذرّہ ذرّہ کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا گیا، اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت تھی، لیکن ہم انہی دلائل پر اکتفا کرتے ہیں۔

علامہ صاحب کا نظریہ، مسلکِ اہلِ سنت والجماعت کے بھی خلاف ہے:

اہلِ سنت والجماعت کے تمام علماً کا اتفاق ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ ہے، وہی ساری مخلوق کے حالات کو جانتا ہے اور وہی ذرّہ ذرّہ سے واقف ہے، کائنات کی

کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ہے، بلکہ علمائے اہلِ سنت والجماعت نے وضاحت اور صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جو شخص حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ غیب جانتے تھے، تو وہ کافر ہے، چند حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

۱:... شارحِ مشکوٰۃ سلطان العلماً حضرت مولانا مُلَّا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ثم اعلم انّ الأنبياء عليهم الصلٰوة والسلام لم يعلموا المغيبات من الأشياء اِلَّا ما علَّمهم الله أحيانًا، وذكر الحنفية تصريحًا بالتكفير باعتقادهٖ انّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يعلم الغيب لمعارضة قولهٖ تعالىٰ: "قل لا يعلم من في السمٰوات والأرض الغيب الا الله" كذا في المسايرة." (شرح فقہ اکبر ص:۱۵۱)

ترجمہ:... "پھر جان لے کہ حضراتِ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مغیبات کا علم نہیں رکھتے تھے، مگر صرف اس قدر جس کا علم اللہ تعالیٰ نے ان کو احیاناً عطا فرمایا ہے، حضراتِ فقہائے احناف نے صراحت کے ساتھ ایسا اعتقاد رکھنے والے کی تکفیر کی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کے لئے علمِ غیب ثابت کرتا ہے، کیونکہ یہ عقیدہ سراسر اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہے کہ: آپ فرمادیجئے کہ جو مخلوق آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، ان میں کوئی بھی غیب نہیں جانتا، ہاں! صرف اللہ تعالیٰ ہی غیب کا علم رکھتا ہے اور بس۔"

۲:... امام فخرالدین حسن بن منصور الاوزجندی الفرغانی الحنفی (التوفی

۲۹۵ھ) لکھتے ہیں:

”رجل تزوّج امرأة بشهادة الله ورسوله كان باطلًا لقوله صلى الله عليه وسلم: لا نكاح إلّا بشهود. وكل نكاح يكون بشهادة الله، وبعضهم جعلوا ذالك كفرًا لأنهٗ يعتقد أنّ الرسول صلى الله عليه وسلم يعلم الغيب، وهو كفر.“

(فتاویٰ قاضی خان برہامش فتاویٰ عالمگیریہ ص:۳۳۴)

ترجمہ:...”ایک شخص نے اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر کسی عورت سے نکاح کیا، تو یہ نکاح باطل ہوگا، کیونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وہ نکاح جو بغیر گواہوں کے ہو وہ نکاح جائز نہیں ہے۔ ویسے ہر نکاح اللہ تعالیٰ کی شہادة سے ہوتا ہے لیکن گواہوں کا حاضر ہونا ضروری ہے، بعض علمأ نے ایسے طریقہ سے ہونے والے نکاح کو کفر قرار دیا ہے، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو نکاح میں گواہ بنا رہا ہے وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ رسول غیب جانتے ہیں، حالانکہ یہ اعتقاد رکھنا کفر ہے۔“

۳:...شیخ الاسلام حافظ الدین محمد بن محمد بن شہاب الدین المعروف بابن البزاز لکھتے ہیں:

”جو شخص حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آپ غیب جانتے ہیں، تو ایسے شخص کے کفر کا خطرہ ہے۔“ (فتاویٰ بزازیہ برہامش عالمگیریہ ج:۴ ص:۱۱۹)

۴:...فتاویٰ عالمگیریہ میں بھی یہی لکھا ہے کہ: جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علمِ غیب جانتے ہیں وہ کافر ہے۔

(فتاویٰ عالمگیریہ ج:۲ ص:۲۶۶)

قارئینِ کرام! اور بھی حوالہ جات موجود ہیں جن میں لکھا ہے کہ جو شخص حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق علمِ غیب کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہے، لیکن ہم انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔

علامہ صاحب نے حدیثِ عمرؓ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ آیاتِ قرآنیہ کے بھی خلاف، احادیثِ صحیحہ کے بھی خلاف اور نظریاتِ صحابہ کے بھی خلاف ہے، اور کسی آیت یا حدیث کا ایسا مطلب بیان کرنا جو دوسرے نصوصِ قطعیہ اور عقائدِ مسلّمہ کے خلاف ہو، ایسا مطلب خود غلط ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیثِ عمرؓ کا کیا مطلب ہے؟ لہٰذا اب حضرت عمرؓ کی بیان کردہ حدیث کا مطلب معلوم کریں۔

حدیثِ بخاری کا مطلب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجلس میں کھڑے ہو کر اُصولِ دین بیان فرمائے اور ضروری باتیں بتائیں، آنے والے فتنوں سے اُمت کو آگاہ اور خبردار فرمایا، الغرض مبدأ و معاد کی تمام اہم اور ضرورت کی تمام چیزوں سے صحابہ کرامؓ کو مطلع فرمایا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذرّہ ذرّہ کے متعلق نجی اور غیر ضروری باتیں بیان فرمائیں، بلکہ ایسی چیزیں نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرضِ منصبی میں شامل ہیں اور نہ ہی آپؐ کے شایانِ شان ہیں، چنانچہ نواب محمد قطب الدین صاحب محدث دہلوی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن

بڑی تفصیل کے ساتھ مبدأ و معاد کے احوال کو اوّل سے آخر تک بیان فرمایا، یعنی پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تخلیقِ کائنات کی ابتدأ کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو قائم کرنے کا ارادہ کیا تو شروع میں کیا کیا چیزیں بنائیں، پھر کس طرح نظامِ عالم کو قائم فرمایا اور اس عالم کو ''انسان'' نامی مخلوق سے آباد کرنے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی اور ان کے ذریعہ نسلِ انسانی کا سلسلہ شروع ہوا، کائناتِ انسانی کی تہذیبی، اخلاقی اور دینی زندگی کا نظم قائم کرنے اور ربِّ کائنات کی حاکمیت اور ہدایت کے ظہور کے لئے کون کون نبی اور رسول اس دنیا میں آئے، کیسی کیسی ملّتیں اور قومیں وجود میں آئیں، ان ملتوں اور قوموں نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، جن لوگوں نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی اطاعت کی ان کو کیا اجر و انعام ملے، اور جن لوگوں نے ان رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی بات ماننے سے انکار کردیا، ان کو کس طرح تباہ و برباد کردیا گیا، اور آخرت میں ان سب ملتوں اور اُمتوں کا کیا حال ہوگا، اور پھر آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے بارے میں بتایا کہ خدا کے آخری دین اسلام کو ماننے والوں یعنی مسلمانوں کی ملّی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب آئیں گے، انہیں کن کن احوال سے دوچار ہونا پڑے گا، کون کون سی اچھائیاں ان کا طرۂ امتیاز بنیں گی، اور کون کون سی برائیاں ان کی دینی اور دنیاوی زندگی کو خراب کریں گی، پھر آخرت میں اس اُمتِ محمدیہ کے ساتھ کیا سلوک ہوگا، کس طرح کے لوگ جنت میں اور کس طرح

کے لوگ دوزخ کے سپرد کیے جائیں گے۔"

(مظاہرِ حق ج:۵ ص:۲۹۱)

آپ نے حدیثِ عمرؓ کی تشریح پڑھ لی ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو فائدے کی سب باتیں بتادیں اور ضرورت کی چیزیں سنادی ہیں، اور آنے والے فتنوں سے خبردار کردیا، کامیابی اور ناکامی کے اُصول بتادیئے، الغرض اُصولِ دین، اُمورِ مہمہ اور ضرورت کی مفید باتیں بتلادیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذرّہ ذرّہ کا علم بتادیا، غیرضروری باتیں بتادیں، بے فائدہ کام اور فضول باتیں سنادیں، کیونکہ ان باتوں سے اُمت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اور نہ ان کی اُمت کو ضرورت ہے، اور نہ ہی یہ اُمور ایک نبی کے شایانِ شان ہیں۔

اگر علامہ صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر دور میں اربوں کھربوں انسانوں میں سے ہر ایک فرد کے نجی اور ذاتی غیرضروری حالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے، مثلاً: ہر ایک آدمی روزانہ کیا کھائے گا اور کتنا کھائے گا؟ کیا پیئے گا اور کتنا پیئے گا؟ اُس کے منہ سے کیا نکلے گا اور کتنا نکلے گا؟ روزانہ کیا کام کرے گا اور کتنے کام کرے گا؟ کتنا سوئے گا اور کتنا جاگے گا؟ کتنا چلے گا اور کتنا کھڑا رہے گا اور کتنا بیٹھے گا؟ کتنی دفعہ بیت الخلا جائے گا؟ اور کتنی دفعہ بازار جائے گا؟ اُس کے وجود پر کتنے بال ہوں گے؟ کتنا ہنسے گا اور کتنا روئے گا؟ کہاں مرے گا؟ کون کون سے لوگ اس کا جنازہ پڑھیں گے؟ ان کی پھر کیا کیا علامتیں ہوں گی؟ کہاں دفن ہوگا؟ جس قبرستان میں دفن ہوگا وہاں کتنے درخت ہوں گے اور کتنی مٹی ہوگی اور کتنی گھاس ہوگی؟ اس کی لاش کب قبر میں پھٹے گی اور کب گلے سڑے گی؟ وغیرہ وغیرہ، ہمارے لئے یہ سب باتیں فضول اور لایعنی ہیں اور اُمت کو ان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اگر علامہ صاحب یہی سمجھتے ہیں تو یہ ان کا سوئے فہم ہے، پھر انسانوں سے زیادہ تعداد جانوروں کی ہے، پرندے ہیں، چرندے ہیں اور درندے ہیں، کیا آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام حیوانوں کے نجی اور غیر ضروری حالات بتائے ہوں گے؟ پھر ان سب سے زیادہ تعداد حشرات الارض کی ہے، کیا ان سب کیڑوں مکوڑوں کے نجی اور غیر ضروری حالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کئے ہوں گے؟ پھر ان سے زیادہ تعداد جنات کی ہے، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سب حرکات وسکنات اور حالات بیان کئے ہوں گے؟ پھر ان سب سے زیادہ تعداد ملٰئکۃ اللہ کی ہے، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملائکہ کے بھی سب حالات بیان فرمائے ہوں گے؟

نہیں... نہیں ... ہرگز نہیں... کیونکہ یہ باتیں بحیثیتِ نبی و رسول آپؐ کے شایانِ شان نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اُمت کی ضرورت کے لئے مفید باتیں تفصیل سے بیان کی ہیں اور وہی کچھ بیان فرمایا جو کہ آپ کے شایانِ شان تھا، اللہ تعالیٰ کی شان اور ہے، وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے، اور ذرہ ذرہ کا علم اُس کے شایانِ شان ہے، اور مخلوق کے تمام حالات اور حرکات وسکنات کا علم اُسی کو حاصل ہے، یہ خالق و مالک (اللہ) کی شان ہے، مخلوق کی یہ شان ہرگز نہیں ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مبدأ و معاد کے متعلق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ضروری اہم اور مفید باتیں تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں، خصوصاً آنے والے فتنوں سے اُمت کو آگاہ فرمادیا، یہ ہے حدیثِ عمرؓ کا صحیح مطلب، جس سے علامہ صاحب نے خواہ مخواہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذرّہ ذرّہ کا علم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اگر اب بھی علامہ صاحب بضد ہیں تو مزید چند چیزیں بطورِ سوال و استفہام ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، تاکہ حقیقتِ حال کھل کر ان کے سامنے آجائے۔

۱:... حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے مجمع میں کھڑے ہوکر مبدأ سے معاد تک کے جو حالات و واقعات بیان فرمائے تھے، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو قیامت کی حتمی تاریخ بمع سنہ کے بھی بتائی تھی یا نہیں؟ اگر بتائی تھی تو وہ کون سی تاریخ اور کون سا مہینہ ہے؟

۲:... کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر و شاعری کا علم دیا گیا تھا؟ اور کیا اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو شعر و شاعری بھی سکھائی تھی؟

۳:... آپ صلی اللہ علیہ وسلم جادو جانتے تھے؟ اور کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کا علم بھی صحابہ کو سکھایا تھا؟

۴:... اہلِ خیبر نے بکری کے گوشت میں زہر ملا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بعض صحابہؓ نے زہر آلود گوشت تناول فرمایا، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر خود بھی زہر کھایا اور صحابہ کرامؓ کو بھی کھلایا؟

۵:... حدیثِ افک میں سیّدہ عائشہ صدیقہؓ روایت فرماتی ہیں کہ میں اپنے کجاوہ سے باہر نکل کر قضائے حاجت کے لئے دُور چلی گئی، پیچھے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی کا حکم دے دیا، کجاوہ پر پردہ پڑا ہوا تھا، کجاوہ بردار صحابہؓ نے سمجھا کہ میں کجاوہ میں موجود ہوں، حالانکہ میں باہر تھی، انہوں نے بے خبری میں میرا خالی کجاوہ اُونٹ پر کس دیا اور قافلہ روانہ ہوگیا اور میں پیچھے رہ گئی۔ سوال یہ ہے کہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ سیّدہؓ کجاوہ میں نہیں ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظار کیوں نہ فرمایا؟ اور قافلہ کو کوچ کا حکم کیوں دے دیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے بوجھتے، لیکن پھر بھی خاموشی کے ساتھ سیّدہؓ کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟

۶:... بخاری شریف کی جس حدیث سے علامہ صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرّہ ذرّہ کا علم تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرّہ ذرّہ کا علم صحابہ کرامؓ کے سامنے کھڑے ہوکر بیان فرما بھی دیا تھا، اس حدیث کو روایت کرنے والے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کی شہادت کا واقعہ کتابوں میں اس طرح لکھا ہے کہ: ۲۷/ذوالحجہ ۲۳ھ بروزِ بدھ آپؓ مسجدِ نبوی میں صحابہ کرامؓ کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، ابولؤلؤ فیروز مجوسی زہر آلود خنجر لے کر

مسجد کے محراب میں چھپا ہوا تھا، اس ظالم نے عین نماز کی حالت میں خنجر کے پے در پے وار کر کے آپؓ کو شدید زخمی کردیا، آپ پانچ دن تک زندہ رہے، بالآخر یکم محرم الحرام ۲۴ھ بروزِ اتوار کو اس دارِ فانی سے رُخصت ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون!

بقول شما حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو سب کچھ بتادیا تھا، اور ذرّہ ذرّہ کا علم بھی بیان فرمادیا تھا، تو حضرت عمرؓ بھی اس مجمع میں موجود تھے، بلکہ وہی تو اس حدیث کے راوی ہیں، تو لازماً حضرت عمرؓ کو یہ بتایا ہوگا کہ ۲۷/ذوالحجہ ۲۳ھ بروزِ بدھ بوقتِ صبح تیرا قاتل مسجدِ نبوی کے محراب میں چھپا بیٹھا ہوگا، لہٰذا خیال کرنا اپنی جان کا ...اور بقول علامہ صاحب... اس کو ہلاکت میں نہ ڈالنا...سوال یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ بتادیا تھا تو انہوں نے اپنی جان کی حفاظت کیوں نہیں کی؟ حضرت عمرؓ کے پاس مسلمانوں کی جماعت تھی اور مجوسی اکیلا تھا، اس کو تو گرفتار کرنا بالکل آسان تھا، اس کو تو نماز شروع کرنے سے پہلے ہی پکڑا جاسکتا تھا، اب علامہ صاحب ہی بتلائیں گے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ بے خبری میں ہوا یا کہ پوری تفصیل حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بتاچکے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے جان بوجھ کر اس کو گوارا کرلیا؟ حقیقت یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو ان کی شہادت کی خبر تو دی تھی، لیکن واقعہ شہادت کی پوری تفصیل کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ تھا، تفصیل نہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بتائی اور نہ ہی اللہ کے نبی نے صحابہؓ کو بتائی۔

۷:...حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام نبیوں کے نام اور حالات و واقعات بتائے گئے تھے یا نہیں؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب نبیوں کے نام و حالات صحابہؓ کو بتائے تھے یا نہیں؟

۸:...اعلانِ نبوت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دینِ اسلام کو، قرآن کو، وحی کو، اَحکام و شرائع وغیرہ سب کو جانتے تھے یا نہیں؟ جبکہ قرآن کہتا ہے: "مَا کُنْتَ

تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ'' اس کا ترجمہ ''کنزالایمان'' میں یوں لکھا ہے:
''(اے پیغمبر!) اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے، نہ احکامِ شرع کی تفصیل۔''

۹:... بخاری شریف صفحہ:۱۹۴ پر یہ حدیث موجود ہے کہ: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً عصر کی نماز پڑھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا، ایک صحابی نے ...جن کا نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ذوالیدین'' رکھا تھا...آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: اے اللہ کے رسول! آپ بھول گئے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز میں قصر کردی گئی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ میں بھولا ہوں اور نہ ہی نماز میں قصر ہوئی ہے! انہوں نے کہا: بلکہ آپ بھول گئے ہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے صحابہؓ سے پوچھا: کیا یہ صحیح کہتا ہے؟ انہوں نے تصدیق کی کہ واقعی آپؐ نے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا ہے، آپؐ بھول گئے ہیں، ذوالیدین سچ کہتا ہے، تب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُٹھ کر دو رکعت اور شامل کیں اور آخر میں سجدۂ سہو کیا۔

صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت تو فرما رہی ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بھول گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بھول کا علم بھی نہ ہوا، جب تمام صحابہؓ نے تصدیق کردی کہ آپؐ واقعی بھول چکے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بھول کا احساس ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقیہ رکعتیں بھی پوری فرمائیں اور سجدۂ سہو بھی فرمایا، اِدھر علامہ صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق کے ذرّہ ذرّہ کا علم ہے، اور اُدھر صحابہ کرامؓ کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول بھول گئے، اور بھول کا علم بھی نہ ہوا، حتیٰ کہ صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔

اب ''نظریاتِ صحابہ'' کا مؤلف خود بتائے کہ حقیقی اور اصلی نظریاتِ صحابہ کیا ہیں؟

۱۰:... مستدرک حاکم، مصنف ابوبکر ابن ابی شیبہ، ابنِ حبان، طبرانی کے

حوالے سے حصنِ حصین میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دُعا منقول ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ."

(حصنِ حصین ص:۱۵۰، ۱۵۱)

ترجمہ:... "اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نفع دینے والا نہ ہو۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دُعا سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ علوم ایسے ہیں جن میں کوئی نفع نہیں ہے، اور ایسے غیر نافع اور غیر مفید علوم سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی پناہ مانگی، اب سوال یہ ہے کہ جن غیر مفید علوم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن سے پناہ ملی یا نہ ملی؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ مل گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذرّہ ذرّہ کا علم ثابت نہ ہوا، اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ نہیں ملی تو کیا جو علوم آپ نہیں چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے زبردستی اپنے پیغمبر کو دے دیئے؟ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا قبول نہ ہوئی؟

قارئینِ کرام! مذکورہ بالا گزارشات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم کے خزانہ سے بہت کچھ عطا کیا، اور یقیناً بہت کچھ عطا کیا اور ساری مخلوق کے علم سے بھی زیادہ عطا کیا، لیکن سارا کچھ عطا نہیں کیا ہے، اور یہی حق اور سچ ہے۔

علامہ صاحب کا حضرت عمرؓ پر بہتان پھر اس کا بطلان:

آپ حضرات نے حدیثِ عمرؓ کا صحیح مطلب تو معلوم کرلیا، چونکہ علامہ صاحب نے بڑی دلیری سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ایک شرکیہ عقیدہ کی نسبت کردی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق کے سارے

حالات جانتے تھے، حالانکہ یہ حضرت عمرؓ پر بہتان ہے اور ان کا دامن ایسے شرکیہ عقائد سے پاک وصاف ہے، لہٰذا چند دلائل آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ علامہ صاحب کے بہتان کا بطلان ہوجائے۔

۱:... حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں بہت سے مسائل صحابہ کرامؓ سے دریافت کرتے تھے، اور بہت سے معاملات میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ مشورے بھی کرتے تھے، بعض اوقات حضرت عمرؓ اپنی دی ہوئی رائے سے رجوع بھی کرلیتے تھے، بقول علامہ صاحب کے اگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کو سب کچھ بتادیا تھا اور کوئی ذرّہ بھی باقی نہیں چھوڑا تھا، تو حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کیوں نہیں کرتے تھے؟ اور صحابہؓ سے مسائل کیوں پوچھتے تھے اور مشورہ کیوں کرتے تھے؟ حالانکہ ان کو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ بتادیا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجلس میں سب کچھ اور ذرّہ ذرّہ بیان نہیں کیا تھا، بلکہ اہم اور ضروری باتیں تفصیل کے ساتھ بتلائی تھیں۔

۲:... حضرت عمرؓ جب دنیا سے رُخصت ہونے لگے تو انہوں نے مندرجہ ذیل چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی اور فرمایا کہ: میرے مرنے کے بعد تم حضرات مشورہ کرکے کسی ایک کو خلیفۃ المسلمین مقرر کرلینا۔ ۱:حضرت عثمان۔ ۲:حضرت علی۔ ۳:حضرت طلحہ۔ ۴:حضرت زبیر۔ ۵:حضرت عبدالرحمٰن بن عوف۔ ۶:حضرت سعد بن ابی وقاص ...رضی اللہ عنہم اجمعین... اس چھ رکنی کمیٹی نے مشورہ کرکے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ بقول علامہ صاحب اگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرّہ ذرّہ بتلادیا تھا تو حضرت عمرؓ کو یہ بھی بتلادیا ہوگا کہ تیرے بعد خلیفہ عثمانؓ ہوگا، جب خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو نامزد کرکے مقرر کردیا تھا اور حضرت عمرؓ کو بتا بھی دیا تھا تو چھ رکنی کمیٹی کو تشکیل دینے کا کیا مطلب؟ اور ان سے مشورہ کرنے کا کیا

فائدہ؟ پس حضرت عمرؓ کے اس طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نامزد خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا، ورنہ کمیٹی اور مشورہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

۳:... علامہ صاحب کا نظریہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی ایک ہی مجلس میں صحابہ کرامؓ کو سب کچھ بتلادیا تھا، سوال یہ ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو اُن کے قاتل کا نام بھی بتایا تھا کہ تیرا قاتل ابولؤلؤ فیروز مجوسی ہوگا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتل کا نام واضح کردیا تھا تو حضرت عمرؓ نے زخمی ہونے کے بعد فوراً کیوں پوچھا کہ: میرا قاتل کون ہے؟ اور جب بتایا گیا کہ آپ کا قاتل ابولؤلؤ فیروز مجوسی ہے تو تکبیر پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ مجھے ایک کافر کے ہاتھ سے شہادت کا درجہ نصیب ہوا۔ معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہادت کی خوشخبری تو سنائی تھی لیکن قاتل کا نام نہیں بتایا تھا، اسی لئے تو حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے اپنے قاتل کا نام پوچھا۔

۴:... نسائی شریف جلد:۲ صفحہ:۲۶۰ پر یہ روایت موجود ہے کہ قاضی شریح نے حضرت عمرؓ کی طرف خط لکھا اور پوچھا کہ میں فیصلہ کس طرح کروں؟ تو حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا: تو فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کر، اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کر، اگر وہ مسئلہ سنتِ رسولؐ میں نہ ہو تو سلف صالحین کے طریقہ کے مطابق فیصلہ کر، اور اگر مسئلہ ایسا درپیش آیا جو نہ کتاب اللہ میں ہے، اور نہ سنتِ رسولؐ میں اور نہ ہی سلف صالحین سے اس کے بارہ میں کچھ منقول ہے تو تجھے اختیار ہے، چاہے تو اجتہاد سے کام لے یا پیچھے ہٹ جا، یعنی خاموش رہ اور دخل نہ دے۔

معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو سنتِ رسولؐ میں نہیں پائے جاتے اور ایسے مسائل میں سلف صالحین کی تقلید کرنی پڑتی ہے، بقول علامہ صاحب جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ اور دیگر

صحابہ کرامؓ کو سب کچھ بتلادیا تھا تو حضرت عمرؓ کے اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ اگر مسئلہ سنتِ رسولؐ میں نہ ہو تو سلف صالحین کی تقلید کرنا، پس ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کا اعتقاد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرّہ ذرّہ نہیں بتلایا، بلکہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو سنتِ رسولؐ میں نہیں تھے۔

جو شخص بھی ان دلائل میں غور وفکر کرے گا وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ علامہ صاحب نے ایک غلط عقیدہ کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی طرف کردی، حالانکہ اُن کے نفوسِ قدسیہ، شرکیہ عقائد سے کوسوں دُور ہیں، رضی اللہ عنہم اجمعین الیٰ یوم الدین!

ضروری انتباہ:

علامہ صاحب نے بخاری شریف کی شروح اور حواشی کے حوالے دے کر عوام الناس کو یہ تأثر دیا ہے کہ بخاری شریف کے شارحین حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذرّہ ذرّہ کے علم کے قائل ہیں، حالانکہ بخاری شریف کا کوئی شارح، بلکہ کوئی محدث اور کوئی فقیہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کا قائل نہیں ہے، چنانچہ:

۱:... حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ شارحِ بخاری ایک حدیثِ بخاری کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے۔

(فتح الباری شرح بخاری ج:۱۳ ص:۱۵۱)

۲:... علامہ بدرالدین عینیؒ شارحِ بخاری لکھتے ہیں کہ: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری ج:۱۱ ص:۲۷۱)

۳:... امام قسطلانیؒ شارحِ بخاری فرماتے ہیں کہ: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے۔ (ارشاد القاری شرح بخاری ج:۱۰ ص:۲۰۲)

۴:... علامہ الحسین بن عبداللہ بن محمد الطیبیؒ لکھتے ہیں کہ: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے۔ (بحوالہ انجاح الحاجہ ص:۱۶۹)

نوٹ:... مذکورہ بالا چاروں حوالے محقق العصر شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صاحب صفدرؒ کی معرکۃ الاراٗ کتاب ''ازالۃ الریب عن عقیدۃ علم الغیب'' سے نقل کئے گئے ہیں۔

الحمدللہ! ثم الحمدللہ! کہ دلائلِ صحیحہ قویہ سے ثابت ہوگیا کہ ذرّہ ذرّہ کو جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور مخلوقات کے تمام حالات کو جاننے والا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کا علم ہر شئے کو محیط ہے، کائنات کی کوئی چھوٹی بڑی چیز اُس سے مخفی نہیں ہے، عالم الغیب صرف وہی، اور صفتِ علم میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، درحقیقت یہی نظریاتِ صحابہ ہیں...!

نمبر۱۵:... علامہ صاحب اس نمبر میں لکھتے ہیں:

> ''صحابہ کا یہ اعتقاد تھا کہ اللہ اور رسول اعلم ہیں (بہت علم والے)، دونوں کے لئے ایک خبر ''اعلم'' بیان کرتے تھے، فرق نہ کرتے تھے، اللہ بھی اعلم، حضور بھی اعلم، صحابہ نے حضور سے کہا: اللہ ورسولہٗ أعلم ۔اب جولوگ حضور کے علم کی کمی بیان کرتے ہیں وہ گستاخِ صحابہ اور نظریاتِ صحابہ کے منکر ہوکر بے دین ہوگئے۔'' (نظریاتِ صحابہ ص:۳۰)

الجواب باسم ملہم الصواب:

علامہ صاحب نے یہ نہیں بتلایا کہ صحابہ کرامؓ رضی اللہ عنہم یہ جملہ ''اللہ ورسولہٗ أعلم'' کس موقع پر استعمال کرتے تھے، اگر حقیقت بتلادیتے تو ظاہر ہے ان کا من مانا مطلب حاصل نہ ہوتا، اسی لئے حقیقت پر پردہ ڈال کر اپنے مطلب کو نکالنے

کی کوشش کی، لیکن کب تک؟ لہٰذا پہلے آپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ کو تعلیم دینے کی نیت سے کوئی دینی بات صحابہ کرامؓ سے پوچھ لیتے تھے اور مقصد پوچھنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ مقصد ان کو بتلانا ہوتا تھا، پس ایسے موقع پر صحابہ کرامؓ کہتے تھے: "اللہ ورسولہٗ أعلم" یعنی اس دینی مسئلہ کو اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ تو سب سے زیادہ جانتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں اور کائنات کی کوئی چیز اُس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے، اور چونکہ ایک دینی مسئلہ ہم سے دریافت کیا گیا، اور دینی احکام و مسائل کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ گویا صحابہ کرامؓ "اللہ ورسولہٗ أعلم" کہہ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دینی مسائل اور احکام کو اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ علامہ صاحب نے "اللہ ورسولہٗ أعلم" والا جملہ بخاری شریف جلد:۱ صفحہ:۱۱، ۱۹ سے نقل کیا ہے، ان دونوں جگہوں پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سوال منقول ہے: "أتدررن ما الایمان؟"، "ھل تدرون ما الایمان؟" یعنی کیا تم جانتے ہو کہ ایمان کیا ہے؟ اس موقع پر صحابہؓ کہتے ہیں: "اللہ ورسولہٗ أعلم" یعنی اللہ اور اُس کا رسول ایمان کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اب بات تو صرف اتنی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک اللہ کے رسول دین و ایمان کی باتیں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، اور یہ حقیقت ہے، اس میں تو کسی کو اختلاف کی گنجائش بھی نہیں ہے، لیکن علامہ صاحب نے "اللہ ورسولہٗ أعلم" سے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رسول بھی سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ علامہ صاحب کی سمجھ کا قصور اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے، اگر موقع و محل دیکھ لیتے تو غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے، لیکن علامہ صاحب مجبور ہیں، اگر بات کی حقیقت کھول کر بیان کر دیا کریں تو اُن کا خودساختہ عقیدہ ثابت نہیں ہوتا، اسی لئے حقائق پر پردہ ڈال کر اپنی من مانی تشریح کر لیتے ہیں۔

بہر حال ''اللہ ورسولہٗ أعلم'' کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین وایمان کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرح سب کچھ جاننے والے ہیں۔

علامہ صاحب کا ایک غلط اُصول:

علامہ صاحب نے دیکھا کہ ''اللہ ورسولہٗ'' مل کر مبتدأ بنتے ہیں اور ''اعلم'' ان دونوں کی ایک خبر ہے، پس جب دونوں کی خبر ایک ہے تو اللہ اور اس کے رسول کے علم میں مساوات اور برابری ہوگئی، لہٰذا اللہ بھی اعلم اور رسول بھی اعلم، پس دونوں کا علم برابر ہوگیا اور کوئی فرق نہ رہا، اور جو اللہ اور اُس کے رسول کے علم میں فرق کرے گا وہ گستاخِ صحابہ ہوکر بے دین ہوجائے گا۔

بندہ، علامہ صاحب کی خدمت میں عرض گزار ہے کہ آپ نے یہ اُصول کہاں سے حاصل کیا؟ اور کس کتاب میں پڑھا کہ جب چند اشیا یا اشخاص کی ایک خبر لائی جائے تو ان میں ایسی مساوات اور برابری آجاتی ہے کہ کوئی فرق باقی نہیں رہتا، اور اگر کوئی فرق کرے گا تو وہ بے دین ہوجائے گا اور گستاخ ہوجائے گا؟ یہ اُصول قرآن میں ہے یا حدیث میں؟ فقہ میں ہے یا اُصولِ فقہ میں؟ صرف میں ہے یا نحو میں؟ منطق میں ہے یا فلسفہ میں؟ علمِ بیان میں ہے یا علمِ ادب میں؟ کس نے لکھا ہے؟ اور کس کتاب میں لکھا ہے؟ میری دانست کے مطابق یہ اُصول علامہ صاحب کا خانہ ساز ہے، جیسے علامہ صاحب کے عقائد خانہ ساز ہیں، عملیات خانہ ساز ہیں، نظریات خانہ ساز ہیں، اسی طرح ان کے اُصول بھی خانہ ساز اور جعلی ہیں، جب اُصول غلط ہے، بنیاد ٹیڑھی ہے، اس پر کھڑی ہونے والی عمارت کا خود ہی اندازہ لگالیں...!

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اب چند شواہد آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں، جن سے علامہ صاحب کے خودساختہ اُصول کی حقیقت کھل کر آپ کے سامنے آجائے گی۔

شاہدِ اوّل:

اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرامؓ کے متعلق ارشاد فرمایا:

۱:... "هم المتقون"

۲:... "هم المفلحون"

۳:... "هم المهتدون"

۴:... "هم الفائزون"

۵:... "هم المؤمنون"

۶:... "هم الراشدون"

۷:... "هم الصديقون"

۸:... "هم الصادقون"

قرآنِ حکیم کے مذکورہ بالا مقامات میں آپ غور کریں ہر جگہ "هم" مبتدأ ہے، اس سے صحابہؓ اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے تمام مؤمنین مراد ہیں، اور آگے سب کی خبر ایک ہے جیسے: "المتقون، المفلحون" وغیرہ۔ پس اگر علامہ صاحب کے اُصول کو صحیح مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ سب صحابہؓ کی شان، ان کا مقام اور رُتبہ برابر ہے، ان میں کوئی فرق نہیں ہے، اور جو فرق کرے وہ ایسا ویسا ہے، حالانکہ تمام اہلِ سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درجات اور مقامات میں تفاوت ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہؓ سے افضل ہیں، خلفائے راشدینؓ بالترتیب تمام صحابہؓ سے افضل ہیں، پھر عشرہ مبشرہؓ افضل ہیں، پھر بدر میں شریک ہونے والے افضل ہیں، چوتھا درجہ جنگِ اُحد کے شریک صحابہؓ کا ہے، پھر بیعتِ

رضوان کے شرکاء، ان کے بعد فتحِ مکہ کے وقت مسلمان ہونے والے، اور اسی درجے میں بیعتِ عقبیٰ اُولیٰ اور ثانیہ کے شرکاء صحابہ کرامؓ اور پھر بعد میں مسلمان ہونے والے بھی شامل ہیں، **کما صرح بہ فی کتب العقائد**۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے سب صحابہ کرامؓ کے لئے ایک خبر لائی ہے، لیکن درجات برابر نہیں، بلکہ متفاوت ہیں، تفاوتِ درجات کو مفتی نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے بھی بیان کیا ہے، چنانچہ "**وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى**" پر حاشیہ لکھتے ہیں:

> ''البتہ درجات میں تفاوت ہے، قبلِ فتحِ مکہ خرچ کرنے والوں کا درجہ اعلیٰ ہے۔''

پس جس طرح یہاں خبر ایک ہے، لیکن شان و درجہ میں فرق ہے، اسی طرح "**الله ورسولہٗ أعلم**" میں خبر ایک ہے، لیکن علم میں فرق ہے، اللہ تعالیٰ کا علم ساری مخلوق کے علم سے زیادہ ہے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم دوسرے لوگوں سے، بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم سے کم ہے۔

شاہدِ ثانی:

سورۂ یوسف میں ہے کہ: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو اپنا تعارف کرایا تو فرمایا:

> "**هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَأَخِيْهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ.**" (یوسف:۸۹)
>
> ترجمہ:... ''تمہیں معلوم ہے کہ تم نے جہالت کی حالت میں یوسف اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟''

اس آیت میں "**أنتم**" مبتدأ ہے اور "**جاھلون**" اس کی خبر ہے، یہاں تمام برادرانِ یوسف کو "**جاھلون**" کہا گیا، لیکن ان کی جہالت برابر نہیں تھی، بلکہ بعض میں

کم اور بعض میں زیادہ تھی، کیونکہ بعض کا مشورہ تھا کہ "اُقتـلـوا یـوسـف" اور بعض کا مشورہ تھا کہ "لا تقتلوا یوسف" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جہالت برابر نہیں، حالانکہ خبر ایک ہے، پس ثابت ہوا کہ ایک خبر لانے سے ہر قسم کی برابری ثابت نہیں ہوتی، بلکہ فرق رہ جاتا ہے۔

شاہدِ ثالث:

مسلم شریف میں روایت موجود ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ کو دیکھا کہ وہ نر کھجور کے پھول مادّہ کھجور کے خوشہ میں ڈال رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ: تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم تأبیر کر رہے ہیں، اور اس عمل سے پھل زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اگر یہ کام نہ کرو تو بہتر ہے، صحابہ کرامؓ نے تأبیر کرنا چھوڑ دیا، لیکن پھل کم ہوگیا۔ تو صحابہ کرامؓ نے اس بات کا تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں بشر ہوں اور یہ میرا مشورہ اور رائے تھی اور میرا گمان تھا، اگر میں کسی دینی کام کا حکم کروں تو اس پر ضرور عمل کیا کرو اور اگر کسی دنیاوی کام کا مشورہ دوں تو تمہیں اختیار ہے، میرا مشورہ اپناؤ یا نہ اپناؤ، کیونکہ تم اپنی دنیا کے حالات و معاملات کو زیادہ جانتے ہو۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں:

"أنتم أعلم بأمر دنیاکم!"

(مسلم شریف ج:۲ ص:۲۶۴)

ترجمہ:... "تم اپنے دنیاوی کام کو زیادہ جانتے ہو!"

اس حدیث میں "أنتم" مبتدأ ہے اور "أعـلـم" اس کی خبر ہے، اور خبر بھی ایک ہے، لیکن تمام صحابہ کرامؓ کا علم برابر نہیں تھا، بلکہ کسی صحابی کا علم زیادہ اور

کسی کا کم تھا، حالانکہ خبر ایک ہے، جیسا کہ ''اللہ ورسولهٗ أعلم'' میں خبر ایک ہے، لیکن علم میں فرق ہے، پس جس طرح ''أنتم أعلم'' میں صحابہ کرامؓ کا علم برابر نہیں ہے، بلکہ فرق ہے، اسی طرح ''اللہ ورسولهٗ أعلم'' میں اللہ ورسول کا علم برابر نہیں ہے، بلکہ فرق ہے۔

شاہدِ رابع:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰہُ''

ترجمہ:... ''اے اہلِ کتاب! کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟''

اس آیت میں ''أأنتم'' جمع حاضر کی ضمیر ہے اور مبتدأ ہے، اور ''أعلم'' اس کی خبر ہے، اس کے باوجود سب اہلِ کتاب علم میں برابر نہیں تھے، پس بہر حال ثابت ہوگیا کہ علامہ صاحب کا یہ اُصول کہ جب کئی اشخاص یا اشیاً کی خبر ایک ہو تو ان میں برابری ہوتی ہے اور کوئی فرق نہیں رہتا، غلط ہے، اور کتاب وسنت کے خلاف ہے۔

نظریاتِ صحابہ ونظریاتِ رسول اللہؐ:

علامہ صاحب نے جب دیکھا کہ صحابہ کرامؓ کہتے ہیں ''اللہ ورسولهٗ أعلم'' تو فوراً اس کو ''نظریاتِ صحابہ'' میں شامل کرلیا، اور اللہ و اُس کے رسولؐ کے علم کو برابر کردیا، لیکن یہ نہ دیکھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ کو فرما رہے ہیں کہ: ''أنتم أعلم'' یعنی دنیاوی اُمور میں تم ''أعلم'' (زیادہ جاننے والے) ہو، پس ثابت ہوا کہ دینی اُمور میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''أعلم'' (زیادہ جاننے والے) ہیں، اور دنیاوی اُمور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق صحابہ کرامؓ ''أعلم'' (زیادہ جاننے والے) ہیں۔ واللہ اعلم کہ علامہ صاحب نے ''أنتم أعلم بأمر دنیاکم'' کو ''نظریاتِ صحابہ'' میں شامل کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ یہ نظریہ تو

صحابہ کرامؓ کو خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے نظریہ میں تو کسی قسم کا شک وشبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ دنیاوی اُمور کو زیادہ جانتے ہیں، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دینی اُمور کو زیادہ جانتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ کو جانتے ہیں اور وہ اپنی صفتِ علم میں وحدہٗ لا شریک ہیں، علم میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں ہے، اور جو شخص اللہ کے رسول کو صفتِ علم میں اللہ تعالیٰ کا شریک بناتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا علم برابر ہے، تو وہ کافر ہے، چنانچہ مُلّا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"من اعتقد تسوية علم الله ورسوله يكفر اجماعًا." (موضوعاتِ کبیر ص:۱۶۲)

ترجمہ:... "جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کا علم برابر ہے، تو اس کو بالاجماع کافر کہا جائے گا۔"

خود حضورِ اکرمؐ نے بعض علوم کے متعلق اپنے "اعلم" ہونے کی نفی فرمادی

بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیثِ جبریل میں ہے کہ: جب حضرت جبریل علیہ السلام نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے متعلق سوال کیا کہ قیامت کب ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"ما المسئول عنها بأعلم من السائل."

ترجمہ:... "مسئول عنہا (جس سے سوال کیا گیا ہے) سائل سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے۔"

اس حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرمارہے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ قیامت کب ہوگی؟ پس ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض علوم

عطا نہیں کیئے گئے، جیسا کہ قیامت کا علم ہے، اسی لئے تو فرمایا: ”**ما المسئول عنها بأعلم من السائل**“ اس کا مطلب یہ ہے کہ: اے جبریل! قیامت کب ہوگی؟ اس معاملہ میں میرا اور تیرا علم برابر اور یکساں ہیں، کیونکہ جس طرح تو قیامت کی حتمی تاریخ کو نہیں جانتا، اسی طرح قیامت کی حتمی تاریخ کو میں بھی نہیں جانتا۔

علامہ صاحب کے فتویٰ کی اُڑان:

علامہ صاحب نے فتویٰ صادر کیا کہ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی کمی بیان کرتے ہیں وہ گستاخِ صحابہ اور نظریاتِ صحابہ کے منکر ہوکر بے دین ہوئے، لیکن حدیث میں خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کی حتمی تاریخ کے متعلق اپنی لاعلمی کو ظاہر فرمارہے ہیں، لیکن یقین جانئے کہ علامہ صاحب کا یہ فتویٰ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں جاسکتا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت اعلیٰ اور اَرفع ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر یہ فتویٰ جائے گا کہاں؟ علامہ صاحب کے اندر سے نکلنے والی بات ہے، رائیگاں تو نہیں جائے گی، مجھے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس فتویٰ کو کہیں ٹھکانا نہ ملے گا تو بالآخر جہاں سے نکلا، وہاں ہی لوٹے گا، کیونکہ وہ مقام اس کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعتقاد:

علامہ صاحب نے نمبر:۱۴ میں حضرت عمرؓ پر بہتان باندھا تھا کہ ان کا اعتقاد تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سب کچھ جانتے ہیں، اور صحیحین کی مذکورہ بالا حدیث، حدیثِ جبریل کو روایت کرنے والے حضرت عمرؓ ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی حتمی تاریخ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہیں تھی، پس معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کا اعتقاد یہ تھا کہ قیامت کی حتمی تاریخ کا علم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا گیا تھا۔

نمبر۱۶:...اس نمبر میں علامہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''صحابہ حضور علیہ السلام کو بے مثل مانتے تھے۔ قالوا انا لسنا کھیئتکم یا رسول اللہ ، یا رسول اللہ! ہم آپ کی مثل نہیں۔ لم أر قبلہٗ و بعدہٗ مثلہٗ ، یعنی حضور جیسا نہ پہلے دیکھا نہ بعد میں۔ اب جو لوگ بے مثل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مثلیت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صحابہ کے نظریات کے منکر ہو کر بے دین ہوئے۔'' (نظریاتِ صحابہ ص:۳۰،۳۱)

الجواب باسم ملہم الصواب:

پوری اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اجماع ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شان کے لحاظ سے بے مثل ہیں، آپ کا مقام ساری مخلوق سے اُونچا اور بلند و برتر ہے، آپ کی شان اور آپ کا مقام تو دوسرے نبیوں سے بھی اعلیٰ و اَرفع ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیرالخلائق اور سیّد الانس والجن ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاءؑ والمرسلین ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق افضل الناس ہیں، بلکہ افضل الکائنات ہیں، آج تک کسی مسلمان نے شان میں آپ کے مثل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا ہے:

وأحسن منک لم تر قط عيني
وأجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرأً من کل عيب
کأنک قد خلقت کما تشاء

ولنعم ما قيل:

یا صاحب الجمال ویا سیّد البشر

من وجھک المنیر لقد نوّر القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ

بعد از خدا بزرگ تو ای قصہ مختصر

القصہ! اگر آپ سیرتِ مصطفیٰ اور مقامِ رسولؐ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو علمائے اہلِ سنت والجماعت دیوبند کثر اللہ جماعتہم کی کتابوں کا مطالعہ کریں، اور ان کے بیانات سنیں، انشاءُ اللہ آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملے گی، اور آپ کو دِل کا سرور نصیب ہوگا۔ علمائے حقہ کی تقریریں اور تحریریں آپ کے لئے ''ازالۃ الریب'' ثابت ہوں گی، اور ''تسکین الصدور'' کا سامان مہیا کریں گی، علمائے ربانیین کی کتابیں آپ کو ''المھند علی المنفد'' کے ہتھیار سے مسلح کردیں گی، اور انہیں سے آپ کو ''راہِ سنت'' ملے گی، بہرحال یہ ایک حقیقتِ مسلّمہ ہے کہ علمائے دیوبند کے قلوب عشقِ مصطفیٰ سے معمور اور ان کے وجود سعود اتباعِ مصطفیٰ کے جذبہ سے شرابور ہیں، ان کی زبان اور ان کا قلم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کرنے میں رطب اللسان ہیں، لیکن..... اس شان کے باوجود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں اور اولادِ آدم، آپ کی مقدس انسانیت اور مطہر بشریت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی کوئی مائی کا لال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیّدِ ولد آدم ہونے کا انکار کرسکتا ہے، شان بہت اُونچی ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم محسنِ انسانیت ہیں، مقام بہت بلند ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیّد البشر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی ہیں بلکہ سیّدِ ولد آدم ہیں۔

علامہ صاحب! آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شان میں ضرور بے مثل کہیں، آپ کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں کرے گا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے مثل کہتے وقت ''قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ'' کو آنکھوں کے سامنے رکھنا ہوگا، کیونکہ یہ قرآن کی آیت ہے، یہ اللہ ربّ العالمین کا فیصلہ ہے، اور یہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کی زبانی اعلانِ خداوندی ہے، قرآن مجید کے ایک ایک حرف پر ایمان لانا ضروری ہے، "مثلکم" میں پانچ حرف ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے، "بشر مثلکم" پر جو شخص ایمان نہیں رکھے گا تو اُس کے ایمان کی خیر نہیں ہے، اسی لئے تو امام احمد رضاخان صاحب اس لفظ کا صحیح ترجمہ کرنے پر مجبور ہوگئے، چنانچہ ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''(اے پیغمبر!) تم فرماؤ ظاہر صورت بشری میں تو میں تم جیسا ہوں۔'' (کنز الایمان تحت آیت: قل انما انا بشر مثلکم)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ "مثلکم" کا ترجمہ: ''میں تم جیسا ہوں'' کیسا صحیح ترجمہ ہے، واضح رہے کہ "أنا بشر" کا ترجمہ ''ظاہر صورت بشری'' علماً کے نزدیک صحیح نہیں ہے، کیونکہ معمولی عربی دان یا عربی کا طالبِ علم جانتا ہے کہ "أنا بشر" کا ترجمہ ہے: ''میں بشر ہوں''۔ بہرحال "أنا بشر" کا ترجمہ صحیح نہیں کیا لیکن "مثلکم" کا ترجمہ تو بالکل صحیح کردیا... میں تم جیسا ہوں... البتہ سورہ حٰمٓ سجدہ میں اسی آیت کا ترجمہ بالکل صحیح کیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''تم فرماؤ آدم ہونے میں تو میں تم جیسا ہوں۔''
>
> (کنز الایمان)

علامہ صاحب کا اپنے امام پر فتویٰ!

علامہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''جو لوگ بے مثل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مثلیت کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ صحابہ کے نظریات کے منکر ہوکر بے دین ہوگئے۔''

علامہ صاحب سمجھے کہ میرے فتویٰ کی گولی علمائے دیوبند کو جالگے گی، حالانکہ

وہ تو ایمان، علم اور استقلال کے پہاڑ ہیں، یہ ان کے نفوسِ قدسیہ تک علامہ صاحب کے فتویٰ کی رسائی ناممکن ہے:

خاک را چہ نسبت با عالمِ پاک!

لیکن اندھیرے میں فتویٰ کی مشین چلائی، نشانہ خطا ہوگیا اور فتویٰ کی زد میں خود اپنے امام احمد رضا خان صاحب آگئے، کیونکہ انہوں نے "مثلکم" کا ترجمہ "میں تم جیسا ہوں" کر کے مثلیت تو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کر ہی لی۔

لہٰذا "میں تم جیسا ہوں" کہنے والے کو علامہ صاحب جو چاہیں کہیں، کیونکہ ان کا اپنا امام ہے، اگر ہم درمیان میں چھڑانے کے لئے آئیں گے تو ہمیں تو یہ جواب ملے گا کہ: تمہارا کیا حق ہے؟ یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے، تمہیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے...!

لیکن ہم خدالگتی بات بیان کرنے پر مجبور ہیں کہ امام احمد رضا خان صاحب نے "مثلکم" کا ترجمہ "میں تم جیسا ہوں" صحیح کیا ہے، لہٰذا ناکردہ جرم کی سزا ان کو نہ دینی چاہئے، ہاں! ممکن ہے کہ علمائے دیوبند پر تبرا بازی کی وجہ سے انتقامِ حق اسی صورت میں لیا جارہا ہو۔

پس ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شان میں بے مثل ہیں، شان میں ان جیسا کوئی نہیں ہے، لیکن جنس میں "بشر مثلکم" ہیں، جس کی ترجمانی فاضلِ بریلوی نے اس طرح کی ہے کہ:

"میں تم جیسا ہوں!"

نمبر ۱۷:... اس نمبر میں علامہ صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نظریہ تھا کہ ہر بدعت گمراہی نہیں ہوتی، بلکہ کچھ بدعتیں اچھی بھی ہوتی ہیں، کل بدعة ضلالة یہ مخصوص عنہ البعض ہے۔

قال عمر: نِعم البدعة هٰذہ ۔ سارا رمضان نمازِ تراویح جماعت سے پڑھنا اچھی بدعت ہے، اچھی ایجاد ہے۔

اب جو لوگ ہر اچھی ایجاد پر گمراہی کا فتویٰ دیتے ہیں وہ حضرت کے دشمن اور حضرت عمر کے نظریہ سے منہ موڑ کر بے دین ہوئے۔" (نظریاتِ صحابہ ص:۳۱)

الجواب باسم ملہم الصواب:

علامہ صاحب اس نمبر میں ایک چور دروازے سے گھس کر اپنی بدعات اور نئی ایجادات کو سندِ جواز دینے کی کوشش کر رہے ہیں، اور حضرت عمرؓ کے نام نامی کو اپنے من مانے مطلب میں استعمال کر رہے ہیں اور ان کی مقدس شخصیت پر بہتان اُٹھا رہے ہیں کہ ان کے نزدیک ہر بدعت گمراہی نہیں ہوتی، بلکہ کچھ بدعتیں اچھی بھی ہوتی ہیں۔ حالانکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرامؓ ہر قسم کی بدعتوں سے متنفر تھے اور اُن سے کوسوں دُور بھاگنے والے تھے، انہیں لوگوں کو تو براہِ راست حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی:

"ایّاکم والمحدثات! فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة!" (مشکوٰۃ ص:۳۰، سننِ دارمی ص:۵۷)

ترجمہ:... "محدثات سے بچو! دین میں ہر نئی ایجاد بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

"وشر الاُمور محدثاتها وکل بدعة ضلالة!"

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ ص:۲۷)

ترجمہ:... "محدثات برے کام ہیں، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

''من أحدث فی أمرنا ھٰذا ما لیس منه فھو رد.'' (بخاری ومسلم، مشکوٰۃ ص:۲۷)

ترجمہ:... ''جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کرے جو دراصل دین میں سے نہیں ہے، تو وہ نئی چیز مردود ہے (کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہے)۔''

''ما أحدث قوم بدعة اِلَّا رفع مثلھا من السنة، فتمسک بسنة خیر من احداث بدعة.'' (مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:... ''جو قوم بدعت ایجاد کرتی ہے تو بطورِ سزا کے اُس قوم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت سے محروم کردیا جاتا ہے، سنت کو پکڑنا بدعت پیدا کرنے سے بہتر ہے۔''

''من وقر صاحب بدعة فقد أعان علٰی ھدم الاسلام.'' (رواہ احمد، مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:... ''جو شخص کسی بدعتی کی تعظیم کرتا ہے، وہ دینِ اسلام کے گرانے میں تعاون کرتا ہے۔''

''لا یقبل اللہ لصاحب بدعةٍ صومًا ولا صلٰوةً ولا صدقةً ولا حجًّا ولا عمرةً ولا جھادًا ولا صرفًا ولا عدلًا، یخرج من الاسلام کما تخرج الشعرة من العجین.'' (ابن ماجہ ص:۶)

ترجمہ:... ''اللہ تعالیٰ بدعتی شخص کی کوئی عبادت قبول نہیں فرماتے، نہ نماز، نہ روزہ اور نہ حج اور عمرہ، نہ جہاد نہ فرض اور نہ نفل، بدعتی دین سے ایسے خارج ہوجاتا ہے جیسے آٹے سے بال۔''

یہ سب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامینِ مبارکہ ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدعت سے بچنے کی تاکید فرما رہے ہیں اور بدعات کی مذمت بیان فرما رہے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدعات کے خلاف نفرت دلانے والی تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ تمام صحابہ کرامؓ ہر قسم کی بدعات اور محدثات سے متنفر اور بیزار تھے، چنانچہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گیا، وہاں کے مؤذّن نے اذان کے بعد تثویب کہہ دی، تو حضرت ابنِ عمرؓ نے مؤذّن کو فرمایا کہ: تو پاگل ہے! تیری اذان میں جو دعوت تھی کیا وہ لوگوں کو بلانے کے لئے ناکافی تھی؟ اور حضرت مجاہد کو فرمایا کہ: مجھے اس بدعتی سے لے چل اور یہ تثویب بدعت ہے، چنانچہ حضرت ابنِ عمرؓ نے وہاں نماز ادا نہ فرمائی اور اُس مسجد سے باہر چلے گئے۔

"تثویب" کے معنی ہیں کہ اذان دے کر دوبارہ لوگوں کو نماز کے لئے بلانا، اور اذان کے لہجہ میں آواز دینا، چونکہ حضرت ابنِ عمرؓ اس تثویب کو بدعت سمجھتے تھے اس لئے مؤذّن کو اس سے روکا اور بدعت سے اتنے متنفر ہوئے کہ اُس مسجد میں نماز بھی ادا نہ کی۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابنِ ابی شیبہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مؤذّن کو عشاً کے وقت تثویب کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ: اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو۔ (بحر الرائق ج:۱ ص:۴۶۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بدعات سے اتنی نفرت ہے کہ بدعتی آدمی کو مسجد سے نکال دینے کا حکم دے رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ایاکم والتبدع!" یعنی نئی ایجادات اور بدعات سے بچو! حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ہر قسم کی بدعات سے نفرت ہے، اسی لئے ان سے بچنے کی تاکید فرما رہے ہیں۔ (سُننِ دارمی ج:۱ ص:۶۶)

"اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: حضرت

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: دین میں تفرقہ ڈالنے والے اور گروہ بندی کرنے والے لوگوں سے مراد اہلِ بدعت ہیں۔

(تفسیرِ مظہری ج:۳ ص:۳۱۵)

معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ اور سیّدہ عائشہؓ ہر قسم کی بدعات اور ایجادات سے متنفر اور بیزار تھے، اسی لئے تو اس آیت کا مصداق انہوں نے اہلِ بدعت کو قرار دیا۔

”یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ“ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، کہ: سفید چہرے والوں سے مراد اہلِ سنت ہیں، اور سیاہ چہرے والوں سے مراد اہلِ بدعت ہیں۔ (تفسیرِ مظہری ج:۲ ص:۱۱۶)

پس ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے تمام صحابہ کرامؓ ہر قسم کی شرعی بدعات سے متنفر تھے اور کسی صورت میں بھی وہ شرعی بدعات کو گوارا نہیں کرتے تھے، بلکہ فوراً روک دیتے تھے اور بیزاری کا اعلان کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک کسی شرعی بدعت میں کوئی خوبی اور اچھائی نہیں ہوتی تھی، شرعی بدعت کی خرابی اس کی ہر خوبی پر غالب رہتی ہے، لہٰذا شرعی بدعت کی ہر خوبی نظرانداز کرنے کے لائق ہے، اور شرعی بدعت ہر لحاظ سے مردود ہے۔

باقی رہا حضرت عمرؓ کا تراویح کے متعلق یہ فرمان کہ: ”نِعم البدعة هٰذه“ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین راتیں نمازِ تراویح جماعت سے پڑھائی، پھر اُمت پر فرض ہوجانے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کی جماعت چھوڑ دی، اس کے بعد صحابہ کرامؓ انفرادی طور پر نمازِ تراویح ادا کرتے رہے یا پھر دو تین آدمی مل کر بلا اہتمام اپنی جماعت کر لیتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں معاملہ ایسے ہی رہا، اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کے اَوائل میں بھی معاملہ ایسے ہی رہا، لیکن حضرت عمرؓ کے دِل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالی کہ نمازِ تراویح باقاعدہ جماعت کے ساتھ شروع کی جائے، چنانچہ انہوں نے

حضراتِ صحابہ کرامؓ سے اس بارہ میں مشورہ کیا، سب صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا، پس جب باتفاقِ صحابہؓ بیس تراویح کی جماعت کا اہتمام کیا گیا تو حضرت عمرؓ نے جماعت کے اس اہتمام کو لغوی معنی میں ''بدعت'' کہا ہے، یعنی تراویح کی باقاعدہ جماعت اور اُس کا اہتمام ایک نئی چیز ہے، ورنہ شریعت میں بیس تراویح، اس کی جماعت اور جماعت کا اہتمام یہ سب چیزیں سنت ہیں، کیونکہ بیس تراویح اور اس کی جماعت خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور باقاعدہ جماعت کا اہتمام اجماعِ اُمت اور خلفائے راشدینؓ کے عمل سے ثابت ہونے کی وجہ سے سنت ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: ''لن تجمع أمتي على الضلالة'' اور ''عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين'' اس سے ثابت ہوا کہ بیس تراویح اور اس کے تمام اجزا سنت ہیں، بدعتِ شرعی کی تعریف نہ تو تراویح پر صادق آتی ہے اور نہ اس کی جماعت پر، اور نہ ہی جماعت کے اہتمام اور باقاعدگی پر، کیونکہ شرعی بدعت احداث في الدين کو کہتے ہیں، اور دوسرے لفظوں میں جس کو خیر القرون میں دین سمجھ کر نہیں کیا گیا، اگر بعد والے لوگ اس کو دین سمجھ کر کرنے لگیں تو وہ کام بدعت ہے، البتہ احداث للدين اور تبلیغ و تعلیم کے وسائط اور ذرائع بھی بدعتِ شرعی کی حد سے باہر ہیں، اور اسی طرح بدعتِ لغوی پر بھی بدعتِ شرعی کی تعریف صادق نہیں آتی، کیونکہ لغت کا دائرہ علیحدہ اور شریعت کا دائرہ علیحدہ ہے، نیز لغت اور شریعت کی اصطلاحات کو خلط ملط کرنے سے آدمی بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے صرف لغت کے لحاظ سے تراویح کی باقاعدہ جماعت کو بدعت کہا ہے، ورنہ تراویح کی باقاعدہ جماعت سنت ہے، بدعتِ شرعی کی تعریف اس پر بالکل صادق نہیں آتی، چونکہ علامہ صاحب نے اصطلاحِ لغت کو اصطلاحِ شریعت سے خلط ملط کر دیا، جس کی وجہ سے عوام الناس کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، حالانکہ بدعتِ لغوی اور چیز ہے اور بدعتِ شرعی اور چیز ہے، حضرت عمرؓ کا بیس رکعات تراویح کی جماعت کو

بدعت کہنا صرف لغت کے اعتبار سے ہے، کیونکہ شرعی طور پر تراویح کی جماعت ہرگز ہرگز بدعت نہیں ہے، بلکہ خالص سنت ہے، مثال کے طور پر عیدین کے دنوں میں روزہ رکھنا حرام اور ممنوع ہے، کیونکہ یہ دن اللہ تعالیٰ کی مہمانی کے دن ہیں، اور شرعی روزہ رکھنے سے اللہ تعالیٰ کی مہمانی سے اعراض لازم آتا ہے، اس لئے ان دنوں میں شرعی روزہ رکھنا حرام ہے، اور شرعی روزہ کی تعریف یہ ہے کہ صبحِ صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک آدمی روزہ کی نیت سے نہ کچھ کھائے، نہ کچھ پیئے اور نہ عورت کے قریب جائے، یہ تو شرعی روزہ کی تعریف ہے، اور لغوی روزہ یہ ہے کہ آدمی مطلقاً کھانے پینے سے رُک جائے، اگر آدمی نے عیدین کے دنوں میں گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ یا اس سے کم و بیش وقت میں کچھ کھایا پیا نہیں ہے تو یہ شخص لغۃً روزہ دار ہے، لیکن شرعی طور پر اس شخص کو روزہ دار نہیں کہا جائے گا، اور نہ ہی شرعی روزہ کے احکام اس پر لاگو ہوں گے، کیونکہ عیدین کے ایام میں شرعی روزہ رکھنا ممنوع اور حرام ہے، اور عیدین کے ایام میں گھنٹے اور آدھ گھنٹے کے رُکنے والے کو یہ نہیں کہا جائے گا چونکہ یہ شخص لغوی روزہ دار ہے اور اس نے حرام کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ شرعی اصطلاح اور ہے اور لغوی اصطلاح اور ہے، بہرحال عیدین کے دنوں میں اگرچہ ہر شخص لغوی معنی میں صائم (روزہ دار) ہوتا ہے، کیونکہ آدمی سارا دن لگاتار کھاپی نہیں سکتا، بلکہ وقفہ لازماً ہوتا ہے، پس اسی مطلق امساک کی وجہ سے وہ باعتبارِ لغت صائم ہے، لیکن وہ شرعی طور پر صائم نہیں ہے، اور نہ ہی شرعی صوم کی تعریف اس پر صادق آتی ہے، بعینہٖ اسی طرح حضرت عمرؓ نے تراویح کی باقاعدہ جماعت کو لغوی معنی میں بدعت کہا ہے، اس لغوی بدعت سے شرعی بدعت کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

اس کی ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمائیں: لغت میں ''کافر'' چھپانے والے کو کہتے ہیں، اور اسی لغوی معنی کے لحاظ سے کاشتکار کو بھی ''کافر'' کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی دانہ کو زمین میں چھپانے والا ہے، اور شریعت میں ''کافر'' وہ ہے جو ضروریاتِ

دین میں سے کسی چیز کا انکار کردے، لیکن ایک کاشتکار کو لغوی معنی میں ''کافر'' کہا جاسکتا ہے، لیکن شرعی طور پر اس کو ''کافر'' کہنا بالکل صحیح نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ کاشتکار مؤمن ہو اور تمام ضروریاتِ دین پر ایمان رکھنے والا ہو۔ پس جس طرح لغوی کفر سے شرعی کفر ثابت نہیں ہوتا اسی طرح لغوی بدعت سے شرعی بدعت ثابت نہیں ہوتی۔ الحمدللہ! ثابت ہوگیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ''کل بدعة ضلالة'' (ہر شرعی بدعت گمراہی ہے) عام ہے، کوئی شرعی بدعت سے مخصوص نہیں ہے، شرعی بدعت میں نہ کوئی خوبی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی اچھائی، نبی علیہ السلام کا فرمان سچا ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ نئی ایجادات کی ہر خوبی پر بدعت کا خبث غالب ہوتا ہے، بدعت چاہے جیسی حسین وجمیل ہو اور چاہے جیسی رنگین اور دلکش ہو، بہرحال بدعت ہے، اور اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ''کل بدعة ضلالة'' کا عین مصداق ہے۔ حضرت عمرؓ اور دیگر تمام صحابہ کرامؓ کسی شرعی بدعت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، حضور علیہ السلام فرمائیں کہ ہر بدعت گمراہی ہے، اور صحابہ کرامؓ کہیں کہ بعض بدعتیں اچھی ہوتی ہیں ... یہ ناممکن ہے...! مشکل ہے...! بلکہ محال ہے...!

علامہ صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بہتان کھڑا کیا ہے کہ ''وہ بعض بدعتوں کو اچھا سمجھتے تھے'' جس کا ان کو روزِ قیامت جواب دینا ہوگا، حضرت عمرؓ ہر شرعی بدعت کو گمراہی سمجھتے تھے اور کسی شرعی بدعت کو انہوں نے اچھا نہیں کہا۔

علامہ صاحب کا دعویٰ:

علامہ صاحب نے دعویٰ کیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: ''کل بدعة ضلالة'' مخصوص منه البعض ہے، یعنی ہر بدعت گمراہی نہیں ہے، بلکہ بعض بدعات گمراہی ہیں اور بعض بدعات اچھی ہیں۔ تو بندہ عرض کرتا ہے کہ علامہ صاحب شرعی بدعات کی فہرست تیار کریں اور پھر نشان لگائیں کہ یہ شرعی بدعت گمراہی